ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
7 تا 13 مارچ 2002ء

☆ ایمان اور عمل کا باہمی تعلق؟ (منبر ومحراب)
☆ ریاست پاکستان کی ناکامی کا ذمہ دار کون؟ (بحث ونظر)
☆ خون مسلم کی ارزانی اور مسلم امہ کی بے حسی (اداریہ)
☆ طالبان کیا تھے، مستقبل کیا ہے؟ (حقیقت احوال)

قیادتِ نو کی ضرورت

''..... یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ انسانیت اب ایک نئی قیادت کی محتاج ہے۔ اب تک انسانیت کی یہ قیادت اہل مغرب کے ہاتھ میں تھی مگر اب یہ قیادت رو بہ زوال ہے۔ اس قیادت کے زوال کا یہ سبب نہیں ہے کہ مغربی تہذیب مادی لحاظ سے مفلس ہو چکی ہے یا اقتصادی اور عسکری اعتبار سے مضمحل ہوگئی ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مغربی انسان ان زندگی بخش اقدار سے محروم ہو چکا ہے جن کی بدولت وہ قیادت کے منصب پر فائز رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تاریخ کے سٹیج پر اس کا رول تمام ہو چکا ہے اور ایک ایسی قیادت کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے جو ایک طرف تو یورپ کی تخلیقی ذہانت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مادی ترقی کی حفاظت کر سکے اور اسے مزید نشو ونما دے سکے، اور دوسری طرف انسانیت کو ایسی اعلیٰ واکمل اقدار حیات بھی عطا کر سکے، جن سے انسانی علم اب تک نا آشنا رہا ہے اور ساتھ ہی انسانیت کو ایک ایسے طریق زندگی سے بھی روشناس کرا سکے جو انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہو، مثبت اور تعمیری ہو اور حقیقت پسندانہ ہو۔ یہ حیات آفریں اقدار اور منفرد نظام حیات صرف اسلام کے پاس ہے۔ اسلام کے سوا کسی اور ماخذ سے اس کی جستجو لاحاصل ہے۔''

(سید قطب شہید کی کتاب ''معالم فی الطریق'' کے اردو ترجمہ ''جادہ ومنزل'' سے ایک اقتباس)

سورۃ البقرہ (۵۷)

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرَّحیم

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوْا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ط وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ o مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ط وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ o مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْمِثْلِھَا ط اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ o اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَالَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ o﴾ (آیات : ۱۰۴ تا ۱۰۷)

''اے اہلِ ایمان! تم راعنا مت کہا کرو' بلکہ (اس کے بجائے نبیؐ سے) کہا کرو انظرنا (کہ ہمیں مہلت دیجئے) اور توجہ سے سنا کرو اور کافروں کے لئے تو دردناک عذاب ہے۔ اہلِ کتاب میں سے کفر کرنے والے اور مشرک ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے رب کی جانب سے تم پر کوئی خیر نازل کیا جائے' اور اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مخصوص کر لیتا ہے' اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔ جس آیت کو ہم منسوخ کرتے یا اسے (لوگوں کے ذہن سے) محو کرا دیتے ہیں تو (اس کی جگہ) اس جیسا یا اس سے بہتر (حکم) لے آتے ہیں' کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور تمہارے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی حمایتی ہے اور نہ مددگار۔''

حضور اکرم ﷺ کی محفل میں جب کوئی صحابی فرمان نبویؐ کو کسی وجہ سے صحیح طور پر سمجھ نہ سکتے تو وہ راعنا کہتے کہ حضور ﷺ! ہماری رعایت کیجئے اور دوبارہ ارشاد فرمایئے۔ ایسی مجالس میں جب یہود اور منافقین کا آنا ہوتا تو وہ اس قسم کی صورتِ حال میں بطورِ شرارت راعنا کے لفظ کو کھینچ کر ادا کرتے اور اسے راعینا بنا لیتے' جس کے معنی ہیں: اے ہمارے چرواہے۔ اس پر اگر کوئی اعتراض کرتا تو وہ صاف مکر جاتے اور دعویٰ کرتے کہ ہم نے صحیح لفظ ہی کہا تھا۔ مشرکین کی اس حرکت کا مقصد درحقیقت حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو ذہنی ایذا پہنچانا اور انہیں تمسخر کا نشانہ بنانا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو راعنا کا لفظ استعمال کرنے سے منع فرما دیا اور انہیں ہدایت کی کہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کو نہایت توجہ سے سنا کریں تاکہ دوبارہ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے' تاہم اگر پھر بھی کوئی ابہام رہ جائے تو ''اُنظُرنا'' کے مجلسی کلمہ کے ذریعے حضور ﷺ کو مکرر ارشاد کے لئے مخاطب کیا جا سکتا ہے تاکہ اشکالات کو رفع کر کے پھر آگے بڑھا جائے۔

زیرِ درس دوسری آیت میں یہود اور مشرکین کے اس بغض و عداوت کا ذکر ہے جو وہ اہلِ اسلام سے رکھتے تھے۔ قرآنِ مجید کی صورت میں جو خیرِ عظیم مسلمانوں کو عطا کیا جا رہا تھا' وہ اہلِ باطل کو کسی بھی صورت گوارا نہ تھا۔ بھلا یہود یہ کیسے پسند کر سکتے تھے کہ رشد و ہدایت کا یہ عظیم خزانہ ان کے بجائے کسی اور قوم کے حوالے کر دیا جائے! چنانچہ اس ضمن میں فرمایا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اختیارِ مطلق ہے کہ وہ جسے چاہے اپنی نعمتوں اور رحمتوں کے لئے منتخب فرما لے اور اپنی مرضی و منشاء کے مطابق جسے چاہے اپنے فضل سے نوازے۔

مشرکین اس امر پر اعتراض کرتے تھے کہ مسلمان اگر تورات کو بھی اللہ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں تو پھر اس میں درج احکام کو کیوں بدل رہے ہیں! اسلام میں شریعتِ موسوی کے بعض احکام کو منسوخ کیا گیا' جن کی جگہ قرآن مجید میں نئے قوانین آ گئے جبکہ کچھ کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ خود شریعت محمدی میں بعض ایسے احکام تھے جو ابتدا میں نافذ رہے لیکن بعد میں منسوخ کر دیئے گئے۔ مثلاً وراثت کے قانون سے پہلے ہر شخص پر واجب تھا کہ وہ اپنے اموال کی تقسیم کے لئے وصیت کرے' لیکن جب شرعی طور پر ورثاء اور ان کے حصوں کا تعین کر دیا گیا تو وصیت کرنا لازم نہیں رہا۔ فرما دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی حکم کو منسوخ فرماتے ہیں تو وقت اور حالات کی مناسبت سے اس کی جگہ کوئی بہتر حکم نازل فرما دیتے ہیں۔ یہ اختیار اسی قادرِ مطلق ہستی کو ہے کہ جس چیز کو چاہے' بدل ڈالے اور جس حکم کو چاہے' منسوخ کر دے۔ تمام کائنات پر درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی حکومت ہے اور اس کی مدد و نصرت کے بغیر انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

☆ ☆ ☆

ظلم میں معاونت کرنے والے کے لئے وعید

چوہدری رحمت اللہ بٹر

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَعَانَ عَلٰی خُصُوْمَۃٍ بِظُلْمٍ اَوْ یُعِیْنُ عَلٰی ظُلْمٍ لَمْ یَزَلْ فِیْ سَخَطِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْزِعَ (رواہ ابن ماجہ و صححہ امام البانی فی احادیث الصحیحۃ ۱۰۲۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے کسی جھگڑے پر کسی ظلم کی مدد کی یا کسی ظلم پر مددگار بنا تو وہ اللہ کی ناراضگی میں رہتا ہے جب تک کہ اس ظلم سے علیحدہ نہ ہو جائے۔

آج ہمارے حکمرانوں کو سوچنا چاہیئے کہ وہ بش اور طالبان کے جھگڑے میں ظلم کی مدد کر رہے ہیں یا حق کی۔ امریکہ نے یو این او کے ذریعے افغانستان پر پہلے ناروا پابندیاں لگائیں تو ہم خاموش رہے۔ اور پھر بغیر کسی واضح ثبوت کے طالبان حکومت پر الزامات لگا کر پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوا تو ہم دبک گئے اور اس صریح ظلم پر ظالم کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ذرا سوچنا تو چاہیئے کہ اللہ کے غضب اور ناراضگی میں رہ کر ہم کیا حاصل کریں گے۔ کاش اللہ کے سپریم پاور ہونے کا ہمیں یقین ہو جائے تو ہم اس دنیا کی مادی ترقی سے کبھی مرعوب نہ ہوں۔ لیکن یہ تو تب ہو کہ ہمارا ایمان قرآن مجید پر اور ہادی و رہبر محمد مصطفیٰ ﷺ پر ہو۔ ہمارا کلچر تو مغرب کا چربہ ہے اور رہنما کمال اتاترک جس نے خلافت کی قبا کو چاک کر دیا تھا اور مسلمانوں کا اجتماعی ادارہ ہی ختم کر دیا تھا۔ ؎

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

حافظ عاکف سعید

ہندوستان میں خونِ مسلم کی ارزانی اور مسلم امہ کی بے حسی!

ہندوستان کے شہر احمد آباد میں مسلمانانِ بھارت پر جو قیامت صغریٰ بپا ہے اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ احمد آباد (گجرات) ریلوے سٹیشن پر ٹرین کی بوگی نذرِ آتش کئے جانے کے افسوسناک واقعے کے بعد سے وہاں کے بے گناہ مسلمان ہندو جنونیوں کے جوشِ انتقام کا نشانہ بن رہے ہیں۔ درندگی اور بربریت کے ہولناک مناظر ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے فسادات کو مات دے گئے ہیں۔ ہندوستان جو دنیا کی سب سے بڑی سیکولر جمہوری ریاست ہونے کا مدعی ہے' آج اپنے اصلی روپ یعنی 'ایک تنگ نظر' متعصب' جنونی ہندو ریاست کی صورت میں اقوامِ عالم کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ واجپائی حکومت مسلمانوں کے اس بہیمانہ قتلِ عام کو روکنے میں تاحال ناکام ثابت ہوئی ہے۔ ہندو پولیس اہلکار خاموش تماشائی بنے مسلمانوں کو بربریت کو نشانہ بنتے دیکھتے ہیں اور بلوائیوں کے خلاف کارروائی نہیں کرتے۔ بلکہ ایسی اطلاعات بھی ملی ہیں کہ وہ خود بھی ان بہیمانہ اور وحشیانہ کارروائیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے معاملے میں عالمی ضمیر تو بہت پہلے ہی مردہ ہو چکا ہے' اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن مسلم امہ کا تو فرض بنتا ہے کہ وہ بھارت میں ہونے والے ان واقعات کا سختی کے ساتھ نوٹس لے اور بھارتی حکومت پر دباؤ ڈالے کہ وہ مسلمانوں کے قتلِ عام اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھیرنے کے واقعات کو بلا تاخیر بند کروائے' مسلمانوں پر ظلم و ستم کا پہاڑ توڑنے والے ہندو جنونیوں کو قرار واقعی سزا دے اور مسلمانوں کے نقصانات کی تلافی کا خاطر خواہ انتظام کرے۔ مسلمان ممالک کو چاہئے کہ ہندوستانی حکومت پر ہر ممکنہ طریقے سے دباؤ ڈالا جائے کہ وہ بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کے معاملے کا حتمی طور پر سدباب کرنے اور اس باب کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے لئے ریاستی قوت کا استعمال کرے کہ جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشیدگی اور تناؤ کی اصل بنیاد ہے۔ اس ضمن میں بھارتی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے نہ صرف او آئی سی کا اجلاس بلایا جا سکتا ہے بلکہ بھارتی حکومت سے تجارتی اور سفارتی تعلقات کے مقاطعے کی دھمکی بھی دی جا سکتی ہے۔

تاہم افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی ماضی قریب کی تاریخ اس حوالے سے ہرگز قابلِ رشک نہیں ہے۔ مسلم ممالک میں اتحاد و اتفاق کا فقدان ہے۔ ہر اسلامی ملک کے اپنے اپنے مفادات اور مصلحتیں ہیں۔ اسلام دشمن طاقتیں بڑی کامیابی سے مسلم ممالک کو باہم لڑا کر اپنے مذموم عزائم کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ مسلم ممالک ایک دوسرے کو یکے بعد دیگرے دشمن کا نوالۂ تر بنتے دیکھتے ہیں اور کبوتر کی طرح آنکھیں موند لیتے ہیں۔ حال ہی میں افغانستان پر امریکہ کی ظالمانہ جارحیت پر پاکستان کے مجرمانہ کردار پر مستزاد تمام مسلم ممالک نے جس شان استغناء اور عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور او آئی سی نے جو شرمناک کردار ادا کیا' اس کا خمیازہ پوری ملت اسلامیہ کو بھگتنا ہوگا۔ افغانستان پر آگ کی بارش برسا کر اور طالبان اور مجاہدین کو خون میں نہلانے کے بعد امریکہ نے بھارت کے ذریعے پہلے پاکستان کو تختۂ مشق بنایا اور جہادی تنظیموں کا خاتمہ اس شخص کے ہاتھوں کروایا جو جہادِ کشمیر کا ذکر فخر اور جرات کے ساتھ کرتا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ امریکہ پاکستان کا اسلامی تشخص ختم کرنے اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کو تہہ و بالا کرنے کے درپے ہے اور وہ بتدریج پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے۔ امریکی صدر طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر ایران اور عراق کو اپنا Next ہدف قرار دے چکا ہے اور مسلم امہ بکریوں کے ایک ریوڑ کی مانند اپنی برادری کو یکے بعد دیگرے قصاب کی چھری تلے آتا دیکھ رہی ہے اور اپنے انجام سے بے خبر جگالی میں مصروف ہے۔

مولانا حالی نے آج سے سوا سو (۱۲۵) برس قبل امت مسلمہ کی صورت حال کا جو المناک نقشہ کھینچا تھا' افسوس کہ صورت حال آج بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے — فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے — چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم
پر اس قوم غافل کی غفلت وہی ہے — تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے — ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے
نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ کچھ ہے
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

(باقی صفحہ ۸ پر)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریک خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

جلد 11 شمارہ 9

7 تا 13 مارچ 2002ء

(۲۲ تا ۲۸ ذوالحج ۱۴۲۲ھ)

بانی : اقتدار احمد مرحوم

مدیر : حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: فرقان دانش خراسانی

معاونین: مرزا ایوب بیگ ' سردار اعوان
محمد یونس جنجوعہ

نگران طباعت : شیخ رحیم الدین

پبلشر: اسعد احمد مختار ' طابع: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ' لاہور
مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 03-5869501 فیکس: 5834000
E-Mail:anjuman@tanzeem.org
Website:www.tanzeem.org

قیمت : 5 روپے
سالانہ زرِ تعاون :
اندرونِ ملک.....250 روپے
بیرونِ پاکستان:
☆ یورپ' ایشیا' افریقہ وغیرہ
.....1500 روپے
☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ
.....2200 روپے

قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر''

حضورؐ کا یہ فرمان ہے کہ کوئی شخص حالتِ ایمان میں چوری اور زنا جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کرتا

احادیث میں یہ بھی ہے کہ جس نے صدقِ دل سے کلمۂ شہادت کا اقرار کیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا

محدثین کے نزدیک ایمان قول اور عمل کو کہتے ہیں جو گھٹتا بھی اور بڑھتا بھی ہے

فقہاء کا کہنا ہے کہ ایمان قول کا نام ہے جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے

ایمان کا عمل کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

مسجد دارالسلام باغ جناح میں 22 فروری 2002ء کے خطابِ جمعہ میں

امیر تنظیمِ اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** نے انہی گتھیوں کو سلجھایا ہے

آج ہمیں اپنی توجہ کو اس اہم نکتہ پر مرکوز کرنا ہے کہ ایمان کا عمل کے ساتھ کیا تعلق ہے اور یہ کہ ایمان کی ماہیت اور نوعیت کیا ہے۔ اس مسئلے پر ہمارے ہاں مختلف نقطۂ نظر پیدا ہوئے۔ ایک نکتہ نظر خوارج کا تھا کہ جو اگرچہ بڑے عابد' زاہد اور متقی لوگ تھے لیکن راہ اعتدال سے ہٹ گئے تھے۔ ان کا ایک موقف یہ تھا کہ ایمان اور عمل بالکل ایک شے ہے۔ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر عمل غلط ہے تو انسان زبان سے لاکھ ایمان کا دعویٰ کرے اس کی نفی ہو جائے گی۔ گویا کہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ دائرہ ایمان اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ گویا وہ کافر اور مرتد ہو گیا۔ لہٰذا وہ واجب القتل ہے۔ اس کی جان' مال اور عزت اب دوسرے مسلمانوں کے لئے حلال ہے۔ یہ اتنی بڑی غلطی کی ہے کہ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ خود دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے۔ چونکہ خوارج کی تکفیر پر امت کا اجماع ہے' لہٰذا آج ان کا موقف زیر بحث نہیں۔

ان کے علاوہ باقی مکاتب فکر کے دو دو کے تین جوڑے بنتے ہیں یعنی ایک طرف معتزلہ اور شیعہ ہیں۔ ان دونوں کا بھی تقریباً وہی کہنا ہے جو کہ خوارج کا تھا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا تو ایمان اور اسلام دونوں سے خارج ہو گیا۔ البتہ ان کے نزدیک وہ کافر نہیں۔ یہ ایک عجیب صورت ہے کہ ایک شخص ایمان اور اسلام سے بھی خارج ہو گیا لیکن کافر نہیں ہوا۔ گویا یہ No mans Land کی سی صورتِ حال ہو گئی' یعنی وہ ایمان اور کفر کے بین بین ہے۔ اس کو وہ ''منزل بین المنزلتین'' دو منزلوں کے درمیان ایک منزل کہتے ہیں۔ اس معاملے میں شیعہ اور معتزلہ یک زبان ہیں۔ ان کے بالکل برعکس دو مکاتب فکر مرجیہ اور کرامیہ کے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ایمان ہے اور زبانی اقرار ہے تو پھر عمل سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جنت اور جہنم کا جو بھی معاملہ ہے وہ ایمان کے اقرار پر ہے۔ اگر اقرار ہے تو جنت میں داخلہ لازماً ہو گا۔ چاہے گناہوں کے کتنے ہی انبار ہوں۔ اگر اقرار نہیں ہے تو جہنم میں جانا ہو گا چاہے آدمی کتنا ہی اچھا ہو۔ انہوں نے سارا دارومدار اقرار باللسان پر رکھا ہوا ہے۔ اشاعرہ اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ اصل چیز ''تصدیق بالقلب'' ہے۔ اس کی بڑی عمدہ مثال قرآن مجید میں موجود ہے۔ فرعون کے درباریوں میں سے ایک صاحب تھے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنا ایمان چھپائے رکھا۔ لیکن جب فرعون نے اپنے دربار میں کھل کر یہ بات کہہ دی کہ بس اب ہمیں فیصلہ کر لینا چاہئے کہ موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے تو اس موقع پر وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی حمایت میں تقریر کی۔ اس تقریر کو اللہ نے اعزاز بخشا اور اسے سورۃ المؤمن میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اب ایک امکان یہ ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے ایمان کے بارے میں خفیہ طور پر بتا دیا ہو۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو نہ بتایا ہو بلکہ ان کے دل میں حضرت موسیٰؑ پر ایمان پیدا ہو چکا تھا۔ فرض کیجئے کہ فرعون کے دربار میں اعلان سے پہلے ان کا انتقال ہو جاتا تو اللہ کے ہاں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا۔ اشاعرہ کا موقف ہے کہ جب کہ دل میں تصدیق آ گئی تو وہ مومن ہی سمجھا جائے گا خواہ زبان پر اقرار ہے یا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقرار' یقین قلبی کا لازمی نتیجہ ہے البتہ اس کے اظہار کے اندر کوئی خارجی رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ مثلاً جیسے یہ اجازت دی گئی ہے کہ ایک شخص کلمۂ کفر کہہ کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اسی اجازت کے تحت حضرت عمار بن یاسرؓ نے اپنی جان بچائی جبکہ ان کے والدین حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ نے کلمہ کفر نہیں کہا اور جان دے دی۔ اسی طریقہ سے فرض کیجئے یہ شکل ہو کہ ایک شخص دل میں حضور ﷺ پر ایمان لے آیا ہے۔ لیکن اس خوف سے کہ گردن نہ ماردی جائے ظاہر نہیں کرتا تو وہ مومن ہے۔ یہ اشاعرہ کا موقف ہے۔

ان مکاتب فکر کے درمیان ایک موقف محدثین کرام کا ہے اور دوسرے امام ابوحنیفہؒ' ان کے ساتھی اور تلامذہ ہیں۔ یہ دو موقف کیا ہیں۔ یہ کہ انسان گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے نہ ایمان سے نکلتا ہے اور نہ اسلام سے خارج ہوتا ہے۔ یہ سید المحدثین امام بخاریؒ' امام مالکؒ' امام شافعیؒ اور امام ابن حنبلؒ اور امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے

لیکن ان میں باریک فرق ہے۔ امام بخاریؒ دیگر محدثین اور تین آئمہ ثلاثہ امام مالکؒ امام شافعی اور امام احمد بن حنبلؒ یہ کہتے ہیں کہ عمل بھی ایمان کا جزو ہے۔ اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَ عَمَلٌ' جبکہ امام اعظم کا کہنا یہ ہے کہ نہیں عمل علیحدہ شے ہے ایمان علیحدہ شے ہے۔ اسی طرح ایک فرق یہ بھی ہے کہ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ایمان بڑھتا بھی ہے گھٹتا بھی ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ ایمان نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔ یہ دونوں موقف بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن یہ سب حضرات اہل سنت والجماعۃ کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ایمان کے بارے میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ یہ ظاہری تضاد ہے جس کو سمجھنے کے لئے ہمیں قرآن سے مدد لینا ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ ''اے اہلِ ایمان! جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو (قتال) کے لئے نکلو'' ﴿فَتَبَیَّنُوْا﴾ ''تو دیکھو تحقیق کر لیا کرو﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ ''اور جو شخص بھی تم کو سلام کرے (یا تم سے یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں) تو تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم مسلمان نہیں ہو'' یعنی جو ایمان کا اظہار کر رہا ہے آپ کو ماننا پڑے گا کہ وہ مؤمن ہے۔

چنانچہ اس ضمن میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ حضرت اسامہؓ بن زید اور ایک انصاری صحابی کا ایک جنگ میں ایک کافر سے مقابلہ ہوگیا۔ اس کافر نے جب دیکھا کہ میں ان دو دونوں کے نرغے میں آ گیا ہوں اور اب میرے بچنے کی کوئی شکل نہیں ہے تو اس نے فوراً کہہ دیا ((اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ)) ان انصاری صحابیؓ کے ہاتھ میں نیزہ تھا اور وہ مارنے والے تھے کہ رک گئے۔ البتہ حضرت اسامہؓ نے یہ گمان کیا کہ اس نے جان بچانے کے لئے بہانہ بنایا ہے۔ لہٰذا اپنی تلوار نہیں روکی اور اس کا سر قلم کر دیا۔ جب حضور ﷺ کے علم میں یہ معاملہ آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اے اسامہؓ! قیامت کے دن کیا جواب دو گے جب یہ کلمۂ شہادت مدعی بن کر تمہارے خلاف عدالت الٰہی میں پیش ہوگا کہ میرے ہوتے ہوئے بھی تمہاری تلوار چلی ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضورؐ! اس نے اپنی جان بچانے کے لئے حیلہ کیا تھا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: کہ تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا ہوتا کہ اس میں ایمان موجود ہے یا نہیں!! گویا کہ یہ آپؐ نے واضح فرما دیا کہ اس کی نیت کو جاننے کا تمہارے پاس کوئی طریقہ نہیں۔ بہرحال ایک طرف تو یہ معاملہ ہے کہ جو شخص کہے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ آپ اسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم مؤمن نہیں ہو لیکن دوسری طرف خود قرآن کہہ رہا ہے کہ ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ ''یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اے نبیؐ! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے (ہم مطیع ہو گئے ہیں)'' ﴿وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ '' کہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا'' اسی طرح سورۃ النساء کی ایک آیت سے بھی یہ رہنمائی ملتی ہے کہ یہ دو ایمان علیحدہ علیحدہ ہیں۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ میں فرمایا گیا: ''اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسولؐ پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل فرمائی'' ۔ یہاں ایمان والوں کو کہا جا رہا ہے کہ ایمان لاؤ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کے دو درجے ہیں۔ جو لوگ ایمان کے پہلے درجے میں ہیں انہیں ایمان کے اعلیٰ درجے کے حصول کی دعوت دی جا رہی ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۹۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعلیٰ درجے کے ایمان کا عمل سے کوئی گہرا تعلق ہے۔

ایمان اور عمل کے باہمی ربط کو سمجھنے کے لئے آیئے کچھ احادیث سے مدد لیں۔ ہمیں ایک طرف حدیث ملتی ہے ((وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ)) ''خدا کی قسم فلاں شخص مومن نہیں ہے خدا کی قسم فلاں شخص مومن نہیں ہے''۔ آپ تصور کیجئے صحابہ کرامؓ لرز گئے ہوں گے کہ وہ کون بدبخت اور شقی ہے کہ جس کے ایمان کی نفی پر حضور ﷺ تین مرتبہ اللہ کی قسم کھا رہے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا ((مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ)) فرمایا: ((اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ)) ''وہ شخص جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی امن میں نہیں ہے''۔ یہ نفی کی انتہا ہے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا ((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ''کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا'' کیونکہ کیسے ممکن ہے کہ ایمان بھی ہو اور زنا بھی ہو۔ اسی طرح فرمایا: ((وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ''کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا۔ ((وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ''کوئی شرابی حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا'' لیکن دوسری طرف ایک حدیث یہ بھی ہے ''جو شخص بھی سچے دل سے کہے گا لا الہ الا اللہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا''۔ اس پر حضرت ابوذرؓ کو کچھ تعجب سا ہوا اور انہوں نے پوچھا ((وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ)) '' چاہے اس شخص نے زنا اور چوری کی ہو'' حضور ﷺ نے فرمایا ہاں۔ ((وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ)) ''ہاں چاہے اس نے چوری کی ہو چاہے زنا کیا ہو'' پھر دوسری مرتبہ پوچھا تو حضور ﷺ نے یہی فرمایا۔ تیسری مرتبہ پوچھنے پر آپؐ نے وہی الفاظ دہرائے اور آگے فرمایا ''خواہ ابوذر کو پسند ہو یا ناپسند ہو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور یہ ہوگا''۔ ان احادیث میں سے بعض سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل ایک ہی شے ہے ایک اکائی ہے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف ان احادیث سے جن میں کہا گیا کہ جس نے صدق دل سے کلمہ پڑھا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا' یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل کے درمیان بہت فرق بھی ہے۔ اس کا حل کیا ہے؟ دراصل امام ابوحنیفہؒ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ ایمان کا دارومدار قول پر ہے اور یہ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے' اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ تصدیق قلبی کو دنیا میں ہم verify نہیں کر سکتے۔ کیا معلوم کس کے دل میں ہے' کس کے دل میں نہیں ہے۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے' وہی دلوں کے حال سے باخبر ہے۔ لہٰذا دنیا کے اعتبار سے ایمان کا دارومدار صرف قول پر ہے۔ کسی نے کہا ((اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ)) تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تم مومن نہیں ہو' اسے مسلمان ماننا پڑے گا اور مسلم معاشرے میں جو بھی حقوق ہیں اُسے سب کے سب ملیں گے' چاہے وہ فاسق و فاجر ہو۔ اس اعتبار سے یہ گویا قانونی ایمان ہے جس کا ذکر امام ابوحنیفہؒ نے کیا ہے اور یہ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ اس کے برعکس امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ایمان قول اور عمل کا نام ہے یہ گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے۔ ان سے ان کی مراد تصدیق قلبی والا ایمان ہے۔ دراصل ان کے سامنے وہ احادیث ہیں جن میں عمل کو ایمان کا حصہ بتایا گیا کہ کوئی مومن حالتِ ایمان میں زنا' شراب خوری یا چوری کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ اہل سنت والجماعۃ کے ان دو عظیم افراد کے درمیان یہ ظاہری تضاد ختم ہوتا ہی اس سے ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ دو ایمان علیحدہ ہیں۔ ایک ایمان ظاہری ہے اور ایک ایمانِ باطنی ہے۔ ظاہری کو قانونی اور باطنی کو حقیقی ایمان کہا جا سکتا ہے۔ ظاہری ایمان کا تعلق اقرار باللسان سے ہے جبکہ باطنی ایمان کا تعلق تصدیق بالقلب سے ہے۔ دنیا میں جس کا اعتبار کیا جائے گا وہ پہلا یعنی ظاہری اور قانونی ایمان ہے اور آخرت میں جس ایمان کی بنیاد پر فیصلے ہوں گے وہ باطنی ایمان ہے۔ چونکہ دنیا میں ہم کسی کا دل چیر کر نہیں دیکھ سکتے لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ انسان کے قول اور دعوے پر ہی انحصار کریں۔ باقی رہا یہ معاملہ کہ اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھ رہا' روزہ نہیں رکھ رہا' زکوٰۃ نہیں دے رہا ہے یا استطاعت کے باوجود حج نہیں کر رہا ہے تو اگرچہ یہ گناہ کبیرہ ہیں لیکن ان کی بنیاد پر تکفیر نہیں کی جائے گی۔ ہاں ان جرائم پر شریعت کے مطابق سزا دی جا سکتی ہے۔ اقرار باللسان کے ذریعے دراصل انسان کو قانونی اور آئینی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جس کی بنیاد پر اس کے حقوق کا تعین ہوتا ہے۔

حقیقی ایمان کا تعلق دل کے یقین کے ساتھ ہے۔ عمل کا تعلق اس ایمان سے ہے کیونکہ جب دل میں یقین

ہوگا تو عمل لازماً درست ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ دل میں یقین ہو اور عمل درست نہ ہو لہٰذا قلبی اور حقیقی یقین یا باطنی ایمان میں عمل لازماً اس کا جز بن جاتا ہے۔ اسی طرح آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جو فیصلے ہوں گے وہ بھی قلبی ایمان کی بنیاد پر ہوں گے۔ لہٰذا اہل سنت کا یہ عقیدہ بالکل صحیح ہے کہ جس کے دل میں ذرا سا بھی ایمان ہوگا اگر اس کے اعمال میں برائیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو قیامت کے دن اس کو اولاً جہنم میں ڈالا جائے گا لیکن اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر وہ جہنم سے نکل آئے گا اور قلبی ایمان کی بدولت جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ لیکن اس سے مغالطہ یہ ہوا کہ سمجھ لیا گیا کہ یہ سب مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ حالانکہ اس معاملے کا اسلام یعنی قانونی ایمان سے تعلق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ایمان یعنی باطنی یقین سے ہے۔ اگر آپ قانونی طور پر مسلمان ہیں تو ایک اسلامی حکومت کے صدر یا وزیراعظم بن سکتے ہیں۔ لیکن آخرت کا معاملہ اس حقیقی و قلبی ایمان سے متعلق ہے جو دل میں جاگزین ہو۔ اوّل وہلے میں ایمان کے ذریعے سے جنت میں داخل ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا وزن بھی شامل نہ ہو۔ اگر دنیا میں صرف زبانی اقرار تھا لیکن قلبی یقین حاصل نہیں تھا تو آخرت میں ایسا شخص مومن شمار نہیں ہوگا اور اس کا انجام کفار کے ساتھ ہوگا جیسا کہ منافقین کے بارے میں قرآن میں صراحت موجود ہے۔ یہ بھی جان لیجئے کہ اصل کامیابی اس کا نام ہے کہ میدانِ حشر ہی سے سیدھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم، اللہ تعالیٰ کی ستاری اور غفاری کے صدقے انسان جنت کی طرف بھیج دیا جائے۔ لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب اعمالِ صالح کا وزن بھاری ہو گا۔ قرآن مجید میں شاذ ہی کوئی جگہ ایسی ملے جہاں کہ ایمان کے ساتھ عمل کا تذکرہ موجود نہ ہو۔ سورۃ العصر میں ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا ذکر ہے۔ سورۃ التین پڑھیے تو وہاں بھی یہی صورت ہے: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ لہٰذا عمل صالح تو یقین قلبی والے ایمان کا جزو لازم ہے۔ یہاں سید المحدثین امام بخاریؒ کا قول صدفی صد درست ہے کہ ایمان قول اور عمل کے مجموعے کا نام ہے۔ جبکہ قانونی طور پر امام ابوحنیفہؒ کا قول صد فی درست ہے۔ تاہم آخرت میں جس ایمان کا اعتبار ہوگا وہ ایمانِ حقیقی ہے۔ یہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ آپ اچھی صحبت میں بیٹھیں گے تو خود بخود یہ ایمان بڑھے گا۔ آپ قرآن مجید سمجھ کر پڑھیں گے تو آپ کے ایمان میں اضافہ ہوگا۔ آپ کوئی نیک کام کریں گے اس سے ایمان میں اضافہ ہوگا۔ بُری صحبت میں بیٹھیں گے تو ایسے محسوس ہوگا کہ جو پونجی تھی وہ کچھ گھٹ گئی ہے۔ کوئی برا عمل کریں گے تو اس کا اثر محسوس ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ''انسان جب گناہ کرتا ہے تو ایمان (اگر اس کے دل میں تھا) اس کے دل سے نکل کر اس کے سر پر پرندے کی طرح چکر لگاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرتا ہے تو لوٹ آتا ہے' لیکن اگر توبہ نہیں کرتا تو رخصت ہو جاتا ہے۔'' مختصر یہ کہ ایمان اور عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے' انہیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ ہمیں یقین قلبی والا ایمان اور ایمان کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تعارف کتب

انسانیت کی کہانی' رسومات کی زبانی

مصنف: ڈاکٹر شمس الحق

ضخامت: ۲۲۴ صفحات

قیمت: ۱۴۰ روپے

ملنے کا پتہ: الفوا ئیکسز انٹرنیشنل' ۱۹/۱۱۶ اے' ایبٹ روڈ' لاہور

فون: ۶۳۱۴۳۸۴

''انسانیت کی کہانی' رسومات کی زبانی'' ایک معلومات افزا کتاب ہے جسے بلحاظ رسم و رواج پوری انسانیت کی تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے بڑی محنت' کاوش اور گہرے مطالعے کے نتیجہ میں مختلف ادوار میں انسانی معاشروں میں پائے جانے والے رسم و رواج کو بڑی تفصیل اور آسان اردو زبان میں قلمبند کر دیا ہے۔ ان رسومات میں بہت سی مضحکہ خیز' حیران کن اور خطرناک نتائج پیدا کرنے والی بھی ہیں جبکہ بعض دوسری انسان کے شایانِ شان بھی ہیں جو واقعی اسے اشرف المخلوق کا درجہ دیتی ہیں۔

مصنف نے رسومات کو بہت سے عنوانات کے تحت ذکر کیا ہے جس میں ہر رسم کے آغاز کی وجہ' اس کا انداز اور اس کا انسان کے کردار پر اثر کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

مصنف نے ساری رسومات کا تذکرہ کرتے وقت اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھا ہے اور مسلمانوں کو تنبیہہ کی ہے کہ وہ بھیڑ چال کے طور پر دوسروں کی رسومات کو اختیار نہ کریں بلکہ اسلامی رسم و رواج ہی کو اپنائیں کیونکہ وہ انسان کے مزاج کے مطابق اور معتدل انداز کے حامل ہیں۔ شادی بیاہ کی رسموں کے تذکرے میں حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی شادی کا تذکرہ انتہائی پرتاثیر انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح عورت کی حیثیت جو مختلف ادوار میں رہی اس کا ذکر کر کے اسلام میں عورت کی عظمت حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کی ہے۔

آخر میں مصنف نے انسانی مسائل کا حل خود اعتمادی کو قرار دیا ہے جو انسانوں کو فراریت سے بچاتی اور کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ کتاب مصنف کے عمیق اور وسیع مطالعے کا ماحصل ہے۔

کمپوزنگ کی چند اغلاط بھی موجود ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے۔

اسرائیل کی دیدہ و دانستہ فریب کاریاں

مصنف: پال فنڈلے

مترجم: سعید رومی'

ضخامت: ۳۲۶ صفحات

قیمت: ۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: صفہ پبلشرز' ۱۹۔ اے' ایبٹ روڈ' لاہور

فون: ۶۳۰۷۲۶۹

''اسرائیل کی دیدہ و دانستہ فریب کاریاں'' ایک امریکی مصنف پال فنڈلے کی کتاب Deliberate Deception کا ترجمہ ہے۔ فال فنڈلے ایک پڑھا لکھا' سمجھدار' حقیقت پسند اور صاف گو شخص ہے جو امریکی ایوان نمائندگان کا ۲۲ سال تک منتخب رکن رہا۔ وہ چونکہ اسرائیل کی بے انصافیوں کا نوٹس لیتا تھا اس لئے یہودی لابی نے اس کے خلاف ہمہ گیر مہم چلائی اور زر کثیر صرف کر کے اسے انتخاب میں ناکام کیا۔ پال فنڈلے یہودیوں کے اجتماعی کردار سے بخوبی واقف ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہودی لابی امریکہ میں کس قدر اثر و نفوذ رکھتی ہے اور کتنی مضبوط ہے لیکن اس کے باوجود اس نے جرات سے کام لے کر یہودیوں کی سازشوں اور ان کے مکروہ عزائم کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس پر مصنف کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ان کے عنوانات بالترتیب فتح اور قیام ریاست' تصادم اور ملی بھگت' اندیشہ ہائے امن ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے اسرائیلی ریاست کے قیام میں امریکہ کے کردار' فلسطین پر یہودیوں کے مظالم اور امریکہ کی انتہائی بے انصافی پر مبنی امداد کے بارے میں حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ امریکی کانگریس سال بسال جو رقم اسرائیل کو خیرات کرتی ہے اگر اسے ساری اسرائیلی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو ہر فرد کے حصہ میں ایک ہزار امریکی ڈالر آتے ہیں۔ امریکہ اسرائیل کی اتنی بڑی امداد کرتا ہے لیکن اس کے باوجود یہودی امریکہ کے بارے میں پرخلوص نہیں ہیں۔

جو شخص امریکہ اسرائیل تعلقات اور اسرائیل کے خطرناک' گمراہ کن' مکروہ عزائم سے واقفیت حاصل کرنا چاہے اسے اس کتاب کا مطالعہ کفایت کرے گا۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

امریکہ کی کوشش ہے کہ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنا کر بھارت کا تابع مہمل بنا دیا جائے

امریکہ پوری دنیا میں اپنی بالادستی کے لئے اس علاقے میں بھارت کو چین کے مقابل کھڑا کرنا چاہتا ہے

قادیانیوں کی تکفیر اور توہین رسالت پر سزائے موت کے قانون کے خاتمے سے امریکہ دوہرا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے

کسی سخت عوامی ردعمل کو امریکہ پاکستان کے عدم استحکام کا بہانہ بنا کر اسے ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنے کی کوشش کر سکتا ہے

عیدالاضحیٰ اس عہد کی تجدید کا دن ہے کہ ہم اللہ اور اس کے دین کے لئے اپنی ہر شے قربان کرنے کو تیار ہیں

موجودہ حالات میں ہمیں توبہ کرتے ہوئے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے

مسجد دارالسلام باغ جناح میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے 23 فروری 2002ء کے خطاب عیدالاضحیٰ کی تلخیص

تلاوت آیات اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

تقریباً ایک صدی قبل مولانا حالی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب مسدس حالی کے آخر میں مناجاتِ بحضور سرور کونین ﷺ میں کہا تھا۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

آج اُمت مسلمہ کی موجودہ صورت حال واقعتاً ان دو اشعار کے عین مطابق ہے۔ ایک طرف ہم دیکھ رہے ہیں کہ عالم عرب کے سینے میں اسرائیل کا خنجر پیوست ہے۔ شیرون وہاں بڑھکیں مار رہا ہے فلسطینیوں پر ایف ۱۶ کے ذریعے بمبارمنٹ کی جا رہی ہے۔ دیو ہیکل قسم کے ٹینک ان کی آبادیوں میں گھس کر مکانوں کو مسمار کر رہے ہیں۔ روزانہ بڑی تعداد میں فلسطینی مسلمان مارے جا رہے ہیں۔ اِس وقت جب کہ پچیس تیس کروڑ مسلمان تو عرب دنیا میں بستے ہیں اور مجموعی طور پر ڈیڑھ ارب مسلمان دنیا میں موجود ہیں لیکن سب کا حال ہے کہ ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم''۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کا معاملہ جو قرآن مجید میں یہود کے بارے میں آیا تھا' آج اُمت مسلمہ اس کی تصویر بن گئی ہے۔

اِدھر پاکستان کے حالات بھی اس وقت انتہائی دگرگوں ہیں۔ پاکستان اپنی تاریخ کی شدید ترین مشکلات سے گزر رہا ہے۔ محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہمارے عدم اور وجود کا معاملہ طے ہونے والا ہے۔ ہماری مشرقی سرحد پر بھارت نے دس لاکھ سے زیادہ افواج جمع کر رکھی ہیں جو پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہے اور ایک منٹ کے نوٹس پر وہ کوئی بھی اقدام کر سکتی ہے۔ دوسری طرف امریکہ بھارت کا پشت پناہ بن گیا ہے۔ اس وقت امریکہ کا Strategic Allience بھارت کے ساتھ ہے۔ لہٰذا اسے زیادہ سے زیادہ ہائی ٹیک اسلحہ دیا جا رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ امریکہ اسے براہ راست دے رہا ہے بلکہ اسرائیل بھی امریکہ کے اشارے پر اسے جدید اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔ ویسے بھی بھارت جنگی لحاظ سے ہم سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہے۔ اگرچہ ایٹمی طاقت ہمارے پاس بھی ہے لیکن ایٹم بموں کی تعداد ہمارے مقابلے میں اس کے پاس کہیں زیادہ ہے۔

دراصل بھارت کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں کے ہندوؤں نے ایک دن کے لئے بھی پاکستان کو ذہناً اور قلباً قبول نہیں کیا ہے۔ تقسیم ہند ان کے سینے کا ناسور ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان بنا کر مسلمانوں نے ان کی بھارت ماتا کے ٹکڑے کر دیئے' لہٰذا ان مسلمانوں سے پورا انتقام لینا ہے اور اس تقسیم کو ختم کرنا ہے۔ افسوس کہ تقسیم کے بعد ہم نے بھی اپنے نظریاتی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ چنانچہ آج ہمارے حالات دیکھ کر بھارت کو یہ جرأت ہو رہی ہے کہ اس کے وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی نے کھل کر کہہ دیا ہے کہ ''علیحدہ پاکستان کی کیا ضرورت ہے؟ اب علیحدہ پاکستان ختم ہو جانا چاہئے اور پاک بھارت کنفیڈریشن قائم ہو جانی چاہئے''۔ یہ اُن کے اعتبار سے پہلا قدم ہے' اگر خدانخواستہ پاکستان اس کے لئے مجبور ہو گیا تو سوچئے کیا ہو گا۔ ویسے بھی پاکستان کو مجبور کرنے کے لئے بھارت کے پاس بہت سے ہتھیار ہیں۔ مثلاً پانی کا معاملہ ہے۔ سندھ طاس معاہدہ جو کسی وقت امریکہ نے کرا دیا تھا جبکہ ہم امریکہ کی "Good Books" میں تھے' لیکن اب امریکہ خود بھارت کی پشت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت ہمیں کھلے الفاظ میں دھمکیاں دے رہا ہے کہ پانی روک لیں گے۔ قدرتی طور پر بھی پانی کی شدید قلت ہو چکی ہے اور پاکستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے ہم کالا باغ ڈیم بھی نہیں بنا سکے۔ ہمارے دونوں بڑے ڈیم بھی بتدریج اپنی میعاد کو پہنچ رہے ہیں۔ لہٰذا کچھ ہی دنوں میں ہماری چابی بھارت کے ہاتھوں میں ہو گی۔ اگر بھارت دریائے چناب کا پانی بند کر دے تو یوں سمجھئے کہ علامہ مشرقی کی یہ پیشین گوئی پوری ہو جائے گی کہ ایک وقت آئے گا کہ پنجاب دوبارہ صحرا بن جائے گا — جیسے نہروں کا نظام شروع ہونے سے پہلے مغربی اور وسطی پنجاب صحرا تھا' بس دریاؤں کے اطراف میں دس دس میل تک کچھ ہریالی اور کچھ آبادی تھی' باقی سب صحرائی علاقہ تھا' گنجی بار' نیلی بار' ساندل بار وغیرہ' اسی طرح کچھ عرصے بعد یہاں خاک اڑے گی۔ گویا ہمارے ساتھ معاملہ کرنے اور دباؤ ڈالنے کے لئے بھارت کے پاس چابی موجود ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن اسرائیل کا بھارت کے ساتھ گہرا گٹھ جوڑ ہو چکا ہے۔

ملک کی اندرونی تازہ ترین صورت یہ ہے کہ اب صدر مشرف صاحب سے امریکی کانگریس نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی دستوری شق اور توہین رسالت پر سزائے موت کے قانون کو ختم کرو۔ اس سے پہلے تو تمام امریکی مطالبے پاکستانی حکومت پورے کر ہی رہی ہے' لیکن موجودہ مطالبات امریکہ کی بہت بڑی اور دوہری چال ہے۔ اس چال کے دونوں پہلو بہت خطرناک ہیں۔ یعنی اگر تو پرویز مشرف نے سر جھکا دیا جیسا کہ باقی معاملات میں کیا ہے تو شدید اندیشہ ہے کہ عوام کھڑے ہو جائیں گے۔ پرویز مشرف اگر سمجھتے ہیں کہ افغانستان کے معاملہ میں حکومتی پالیسی کے خلاف چونکہ ملک میں کوئی بڑا ردعمل نہیں ہوا لہٰذا اب بھی نہیں ہو گا' تو یہ ان کی بھول ہو گی۔ افغانستان کا معاملہ دراصل سب لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا' دوسرے یہ کہ پوری دنیا اور مسلم امہ کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ جو کچھ گیارہ ستمبر کو امریکہ میں ہوا وہ اسامہ بن لادن نے کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات بعید از قیاس ہے۔ اسامہ کے لئے اتنی بڑی کارروائی ممکن نہیں تھی۔ یہ سارا ڈرامہ اسرائیل نے

موساد کے ذریعے اس لئے کیا تا کہ امریکی غیض وغضب اور عالمی ذرائع ابلاغ کا رخ افغانستان کی طرف موڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں امریکہ نے افغانستان کا بھرکس نکال دیا۔ اگرچہ اُس وقت امریکہ کے خلاف پشاور' کراچی اور کوئٹہ میں بہت بڑی بڑی ریلیاں بھی نکلیں لیکن پنجاب میں کوئی بہت بڑا ردعمل سامنے نہیں آیا۔ لہٰذا اس وقت تو معاملہ ٹھنڈا رہا۔ البتہ قادیانیوں کی تکفیر کا مسئلہ بہت جذباتی ہے۔ اس کے لئے ۱۹۵۳ء میں ایک عظیم تحریک چلی تھی اور پاکستان کی تاریخ کا پہلا مارشل لاء لگا تھا۔ ختم نبوت تحریک میں لاہور میں سینکڑوں مسلمانوں نے جانیں دی تھیں۔ اگرچہ فوجی کریک ڈاؤن کی وجہ سے وہ تحریک اُس وقت دب گئی' لیکن ۱۹۷۴ء میں وہ عظیم تحریک پھر پورے زور وشور سے اُٹھی۔ اس میں مسلمانوں کے تمام گروہ یعنی دیوبندی' بریلوی' اہل حدیث' شیعہ' سنی اور جماعت اسلامی سب شامل تھے۔ مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ جو کوئی سیاسی آدمی نہیں تھے' بلکہ خالص علمی وتدریسی میدان کے آدمی تھے' وہ اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں قادیانیوں کا معاملہ اس وقت کی قومی اسمبلی کے حوالے کر دیا گیا کہ اس پر غور کیا جائے۔ قومی اسمبلی نے ایک کمیٹی بنا دی۔ اس کمیٹی نے قادیانیوں کو بھی موقع دیا۔ ان کے قائد مرزا ناصر احمد اور لاہوری قادیانیوں کے سربراہ کو بھی کمیٹی نے طلب کیا۔ ان سب کے سامنے کھلم کھلا کارروائی ہوئی۔ جب ناصر احمد نے یہ کہا کہ ''ہاں ہم کہتے ہیں کہ غلام احمد قادیانی نبی تھا اور جو اس کو نہیں مانتا وہ کافر ہے'' تو اسمبلی نے قادیانیوں کو کافر قرار دے دیا۔ یہ اسمبلی کا فیصلہ تھا۔ اب بھی اگر وہی مسئلہ کھڑا ہو گیا تو یہ عوام کے جذبات کے لئے بہت بڑا چیلنج ہوگا۔

اسی طرح توہین رسالت کے قانون سے بھی مسلمانوں کا بہت گہرا جذباتی تعلق ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں کی اکثریت پابندی کے ساتھ اسلام پر عمل پیرا نہیں ہے۔ صرف کچھ اقلیت ہے جو اسلام پر واقعتاً عمل پیرا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر مسلمانوں کے باطن میں اسلامی جذبات موجزن ہیں۔ یہ لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کی ناموس پر اپنی گردنیں کٹوانے میں ہرگز پیچھے نہیں رہیں گے۔ ۱۹۵۳ء میں بھی ایسے ہی لوگ جانیں دینے میں پیش پیش تھے جو ہمارے ہاں نمبر دس کے لوگ کہلاتے ہیں۔ یہ اندرون لاہور سے تعلق رکھنے والے نوجوان تھے جنہوں نے جانیں دی تھیں۔ اس اعتبار سے یہ نوٹ کر لیں کہ اگر یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا اور صدر مشرف نے امریکہ کا یہ مطالبہ مان لیا تو بھی اس کا فائدہ مغربی ممالک اور اسلام دشمن طاقتوں کو ہو گا۔ کیونکہ اس صورت میں پاکستان کا اسلامی تشخص ختم ہو جائے گا اور یہاں پر عریاں سیکولرازم کا ڈنکا بجے گا۔ اور اگر عوام کے اندر سے اس کے خلاف کوئی مزاحمتی تحریک کھڑی ہو گئی تو انہیں بہانہ مل جائے گا کہ فوری طور پر اس اندیشہ کے تحت کہ کہیں ایٹمی ہتھیاروں پر Fundamentalist لوگوں کا قبضہ نہ ہو جائے' امریکہ فوراً جھپٹا مارے گا اور ہماری ایٹمی صلاحیت کو یا تو مفلوج کر دے گا یا اس پر قبضہ کر لے گا۔ گویا کہ بظاہر چت بھی ان کی ہے اور پٹ بھی ان کا ہے۔

اس وقت ہم جہاں کھڑے ہیں وہاں بڑا شدید اندیشہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آخری سزا ملنے والی ہو۔

دراصل امریکہ یہ چاہتا ہے اور بھارت کی بھی دلی خواہش ہے کہ پہلے قدم کے طور پر پاکستان بھارت کا تابع مہمل بن جائے تا کہ امریکہ کی یہ پریشانی ختم ہو جائے کہ اگر وہ بھارت پر عنایات کی بارش کرتا ہے تو پاکستان ناراض ہوتا ہے' اور اگر پاکستان پر کوئی توجہ کرتا ہے تو بھارت ناراض ہوتا ہے۔ اگر پاکستان تابع مہمل بن جائے تو پھر بھارت کو اس علاقے کی سپر پاور بنا کر چین کے مقابلے پر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا امریکہ کی پالیسی بھی یہ ہے کہ اولاً پاکستان تابع مہمل بن جائے بھارت کا' لیکن بالفرض اگر ایسا ہو گیا اور یہاں سیکولر نظام آ گیا تو ظاہر ہے کہ پاکستان کا جواز ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ قیام پاکستان کا واحد جواز اسلام ہے' ورنہ یہ ہر اعتبار سے ایک مصنوعی ملک ہے۔ اس اعتبار سے انتہائی خطرہ ہے کہ اگر یہاں بھی کھلم کھلا سیکولرازم آ جائے اور جو کچھ اسلامی شقیں پاکستان کے دستور میں طے کی گئی ہیں ان کو منا دیا جائے تو پھر واقعتاً اس ملک کا جواز ختم ہو جائے گا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان پہلے تو بھارت کا تابع مہمل بنے گا اور بالآخر بھارت سے کنفیڈریشن تک نوبت آ جائے گی۔ یہاں کے لوگ خود کہیں گے کہ اب علیحدہ ملک کا جواز کیا ہے' ضرورت کیا ہے؟ علیحدہ دو ملکوں کا فائدہ کیا ہے جبکہ بھارت کی معیشت بھی وہی ہے' جو ہماری ہے' ان کی سیاست بھی وہی ہے جو ہماری ہے' ہمارا دستور بھی وہی ہے جو ان کا ہے' تو اگر یہی معاملہ ہے تو نماز اور روزے کی اجازت تو بھارت میں بھی ہے۔ الگ ملک تو ہم نے اس لئے بنایا تھا کہ اسلام کا نمونہ دنیا کو دکھائیں۔ قائداعظم کے قول کے مطابق اسلام کے اصول حریت و اخوت و مساوات کی مثال دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ پاکستان کی کشتی بھنور میں پھنس چکی ہے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ان حالات میں ہمیں اللہ کی جناب میں سچی توبہ کرتے ہوئے غیر اسلامی کاموں سے کنارہ کشی کی روش اختیار کرنی چاہئے اور ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

آج عید الاضحیٰ کا دن ہے۔ اس موقع پر جانوروں کی قربانی دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اللہ اور اس کے دین کے لئے اپنی ذات' مفادات اور خواہشات کو ہر وقت قربان کرنے کے لئے اسی طرح تیار رہیں جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم کے مطابق اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے تو ہمیں خود اپنے طور پر یہ کام کرنا ہے' پھر اللہ سے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلطنت خداداد پاکستان کی حفاظت فرمائے۔ یہ دعا بھی کیجئے کہ اللہ تعالیٰ صدر مشرف کے دل کو بدل دے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہیں' وہ جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ ہم دعا کریں کہ اے اللہ تو صدر مشرف کے دل کو سیکولرازم کی بجائے اپنے دین کی طرف پھیر دے' اے اللہ تو صدر مشرف اور تمام مسلمانان پاکستان کو اپنی طرف' ایمان اور اسلام کی طرف راغب کر لے۔ یہ تیرا اختیار ہے' تیرے لئے یہ مشکل نہیں ہے تو ان کے دلوں کو پھیر دے تا کہ یہ ملک حقیقی معنی میں اسلامی مملکت بنے اور پھر ہم پوری دنیا کو دعوت دے سکیں کہ آؤ دیکھو یہ ہے اسلام' جو ہم نے قائم کر کے دکھا دیا۔ یہ ہے وہ رحمت جو پوری نوع انسانی کے لئے ہے' یہاں ہر سطح پر عدل وانصاف اور تمام عوام کے لئے کفالت کا مثالی نظام موجود ہے۔ آؤ اور دیکھو۔ اور یوں پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو جائے۔ اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

بقیہ : اداریہ

بہائم کی اور ان کی حالت ہے یکساں — کہ جس حال میں ہیں اسی میں ہیں شاداں
نہ ذلت سے نفرت' نہ عزت کا ارماں — نہ دوزخ سے ترساں' نہ جنت کے خواہاں
لیا عقل و دیں سے نہ کچھ کام انہوں نے
کیا دین برحق کو بدنام انہوں نے

مسلمانوں نے اگر اب بھی حالات سے سبق نہ سیکھا اور بیداری کا ثبوت نہ دیا تو اندیشہ ہے کہ پورا عالم اسلام بدترین انجام سے دوچار ہو کر رہے گا۔ **اعاذنا الله من ذالک**

ریاست پاکستان کی ناکامی کا ذمہ دار کون؟

مرزا ایوب بیگ

پاکستان بحیثیت ریاست ناکام ہو چکا ہے' اس بات سے تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ ریاست ناکامی کی راہ پر گامزن ہے۔ مخصوص مفادات کے حامل افراد یا جماعتوں کی بڑھک بازی الگ بات ہے وگرنہ کوئی دیانت دار تجزیہ نگار یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ پاکستان نے کامیابی و کامرانی کی منازل طے کی ہیں۔ آج جب ہم اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو پاکستان سے انتہائی جذباتی لگاؤ رکھنے والا شخص بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ بھارت اور پاکستان ایک ہی وقت میں آزاد ہوئے تھے لیکن صنعت' زراعت اور جمہوری استحکام کے حوالہ سے پاکستان کسی طرح بھی بھارت کے پاسنگ نہیں۔ وہ کمپیوٹر کی صنعت میں جاپان اور امریکہ سے پنجہ آزمائی کر رہا ہے جبکہ ہم اس میدان میں بالکل نووارد ہیں۔ تقسیم ہند کے موقع پر پنجاب بھی تقسیم ہوا۔ ہمارا پنجاب زیادہ زرخیز تھا لیکن آج مشرقی پنجاب زراعت کے میدان میں ہمارے پنجاب سے کہیں زیادہ اچھے نتائج دے رہا ہے۔ چند ماہ پہلے تک پاکستان تکنیکی لحاظ سے دیوالیہ ہو چکا تھا لیکن حالات کے جبر نے قرض خواہوں کو ہمیں دیوالیہ قرار دینے سے روکے رکھا جبکہ بھارت کے زرمبادلہ کے ذخائر ۵۰ ارب ڈالر کے لگ بھگ ہیں۔ سیاسی سطح پر ہماری تاریخ مارشل لاؤں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے سیاست دانوں نے ایسے ایسے جمہوری تماشے دکھائے ہیں کہ قوم شرم کے مارے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی۔ دوسری طرف موجودہ چین بھی ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر انہی دنوں ابھرا جب پاکستان قائم ہوا تھا لیکن وہ آج امریکہ جیسی قوت کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے۔ امریکہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ چین کو کس طرح مزید آگے بڑھنے سے روکا جائے۔ وہ عسکری اور اقتصادی شعبہ میں اس کی انتہائی تیز رفتار ترقی سے پریشان ہے۔ اسرائیل پاکستان کے قیام کے ایک سال بعد وجود میں آیا اور زندگی کے ہر شعبہ میں جس انداز اور جس سرعت سے اس نے ترقی کی ہے' اُس نے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہر سال پاکستان کے قومی بجٹ کو دفاعی اخراجات چٹ کر جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس پاکستان کی سلامتی کو محفوظ نہ رکھ سکے جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا۔ ۲۴ سال میں پاکستان اپنے ایک بازو سے محروم ہو گیا۔ ہم روزِ اوّل سے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیتے رہے ہیں لیکن اپنے ازلی دشمن کے قبضہ سے اپنی یہ شہ رگ نہ چھڑوا سکے۔ تعلیم اور صحت کے شعبوں میں ہم دنیا کے پسماندہ ممالک میں ہیں۔ ہمارے گاؤں اکیسویں صدی میں بھی پینے کے صاف پانی سے محروم ہیں اور ناکامی کے حوالہ سے بدترین بات یہ ہے کہ ہم اندرونی معاملات میں غیروں کی ڈکٹیشن لینے پر مجبور ہیں۔ ہماری خود اعتمادی اور خودی بری طرح مجروح ہو چکی ہے۔

راقم کی رائے میں اس ناکامی میں مرکزی کردار سیاست دانوں' فوج' عدلیہ اور بیوروکریسی نے ادا کیا۔ راقم اپنے تجزیہ میں ان افراد اور اداروں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرے گا جو اس ناکامی کے حقیقی ذمہ دار ہیں البتہ قارئین کو یہ رائے خود قائم کرنا ہو گی کہ کون زیادہ ذمہ دار ہے اور کون نسبتاً کم ذمہ دار!

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام میں برصغیر کے مسلمانوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت میں زبردست تحریک چلائی اور کامیابی حاصل کی۔ مسلم لیگ کے رہنما قائداعظم محمد علی جناح ایک سیاست دان اور پیشہ کے لحاظ سے وکیل تھے۔ انہوں نے جدوجہد آزادی کو ہمیشہ آئین اور قانون کا پابند رکھا۔ قائداعظم بڑے دیانت دار اور محنتی انسان تھے۔ وہ جمہوری روایات کے بڑی شدت سے قائل تھے۔ لہٰذا خیال تھا کہ قائد کی صحبت اور کسی قدر تربیت کی وجہ سے دوسرے مسلم لیگی رہنما پاکستان میں اقتدار اور اختیار کو قومی امانت سمجھیں گے' کرپشن سے پاک حکومت قائم کریں گے اور جمہوری روایات کو زندہ کریں گے۔ لیکن یہ خواب جلد بکھر گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ قائد قیام پاکستان کے بعد صرف ۱۳ ماہ زندہ رہے۔ چنانچہ قائد کی آنکھ بند ہوتے ہی اختیارات کے غلط استعمال اور کرپشن کا آغاز ہو گیا۔ بھارت سے آنے والے مسلمان مہاجروں کی بحالی سے بددیانتی شروع ہوئی۔ جہاں تک سیاست دانوں کی اپنی کرپشن کا تعلق ہے' ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک شاید ہی کوئی سیاست دان اس الزام سے بچ سکا ہو الا ماشاء اللہ۔ اگرچہ ریاست کی ناکامی میں سیاست دانوں کی مالی کرپشن نے اہم کردار ادا کیا لیکن کرپشن چونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریاست کے ہر شعبہ اور معاشرے کے ہر طبقہ میں سرطان کی طرح پھیل گئی تھی لہٰذا اس تحریر میں سیاست دانوں کی ناکامی کا ذکر صرف عوامی نمائندوں اور جمہوری حکمرانوں کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ اگرچہ ایک جمہوری ملک میں کسی شخص کا عملی سیاست میں متحرک حصہ لینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اس ملک میں اصلاح احوال کی خاطر اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے لہٰذا ایک سیاست دان کے لئے اقتدار کی خواہش رکھنا یقیناً کوئی ناپسندیدہ بات نہیں لیکن حصول اقتدار کے لئے ہر جائز اور ناجائز حربہ استعمال کرنا اور ذاتی اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ملک کے قانون' ضابطے حتیٰ کہ آئین کی دھجیاں بکھیر دینا ہمارے سیاست کاروں کا اصل جرم تھا۔ یہ وہ جرم عظیم تھا جو بہت سی دوسری برائیوں اور خرابیوں کی جڑ اور بنیاد بنا۔ ہمارے سیاست دانوں کا اصل الاصول یہ تھا کہ ان کا بسیرا ایوان اقتدار کی غلام گردشوں میں ہونا چاہئے۔ کبھی ایک جماعت میں اور کبھی اس کے برعکس موقف رکھنے والی دوسری جماعت میں' کبھی ون یونٹ کی حمایت کر کے اور کبھی اس کی مخالفت میں سرگرم ہو کر' کبھی جداگانہ طرز انتخابات کے حامی ہو کر اور کبھی مخلوط انتخابات کے چیمپئن بن کر' کبھی پارلیمانی نظام حکومت کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کے نعرے لگا کر اور کبھی کسی فوجی صدر کی کابینہ کا ممبر بن کر' کبھی اسلامی جماعت کا سرگرم رکن ہو کر اور کبھی کٹر سیکولر بلکہ مذہب کا تمسخر اڑانے والی سوشلسٹ پارٹی کے روح رواں بن کر۔ اسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے آغا شورش کاشمیری نے کہا تھا ؎

میرے ملک کی سیاست کا حال مت پوچھ
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

سیاست دانوں کی مذکورہ بالا کارگزاریوں کی چند مثالیں تاریخ پاکستان سے حاضر خدمت ہیں۔ بھارت نے آزادی کے فوری بعد قلیل عرصہ میں آئین بنا لیا اور جمہوریت کی گاڑی چل پڑی جبکہ پاکستان میں نو سال تک آئین نہ بن سکا۔ بہت سی دوسری وجوہات کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان چار سال سے زائد عرصہ وزیراعظم رہے جبکہ آئین کی تشکیل کے بعد نئے انتخابات لازم تھے لیکن وزیراعظم چونکہ مہاجر تھے اور پاکستان میں ان کا اپنا کوئی حلقہ انتخاب نہیں تھا لہٰذا سب کچھ ملتوی ہوتا چلا گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد گورنر جنرل ہاؤس پر بیوروکریسی قابض ہو گئی۔ آئین اور انتخابات اب ان کے اقتدار کے لئے خطرہ

بن سکتے تھے لہٰذا مزید پانچ سال تک آئین نہ بن سکا۔ پاکستان کے سیاست دان اتنے کرشمہ ساز تھے کہ ایک رات میں پارلیمنٹ کے اندر ایک نئی ملک گیر پارٹی کو جنم دے لیتے تھے۔ اس کا نام اگرچہ ری پبلکن پارٹی تھا لیکن عوام کو اس پارٹی کے قیام کی اطلاع اگلی صبح اخبارات کے ذریعے ہوئی۔ خواجہ ناظم الدین پاکستان کے وزیر اعظم تھے لیکن گورنر جنرل غلام محمد جو بنیادی طور پر ایک بیوروکریٹ تھے انہوں نے وزیر اعظم کو کان سے پکڑ کر ایوان اقتدار سے نکال دیا اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر لا بٹھایا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اسمبلی ممبران جو ہر دم خواجہ ناظم الدین سے وفاداری کا دم بھرتے تھے انہوں نے بغیر حیل و حجت بوگرہ صاحب کے دست مبارک پر بیعت کر لی۔

لیاقت علی خان کے بعد پانچ سالوں میں چھ وزیر اعظم آئے۔ آئی آئی چندریگر چون دن کے لئے وزیر اعظم رہے۔ ان چھ میں سے تین یعنی ناظم الدین' بوگرہ اور سہروردی مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا وہاں سے وزرائے اعظم کی آمد روکنے کے لئے پیریٹی کا قانون منظور ہوا۔ یہ اس طرح ممکن ہوا کہ مغربی پاکستان کے صوبے ختم کر کے ون یونٹ بنا دیا گیا اور دونوں صوبوں کے لئے نشستیں یکساں کر دی گئیں حالانکہ مغربی پاکستان کا ون یونٹ بنانے کے باوجود مشرقی پاکستان کی آبادی زیادہ تھی۔ صوبوں کے خاتمہ سے عوام کی تکالیف میں اضافہ ہوا اور انہیں اپنے مسائل کے حل کے لئے دو دراز کا سفر کرنا پڑا جس سے صوبائی تعصب اور نفرت بڑھی۔ لیکن مغربی پاکستان کے بعض سیاست دان اقتدار کے لئے اپنی راہ ہموار کرنے کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ اس سے مشرقی پاکستان میں حق تلفی کا احساس پیدا ہوا۔

یہ ان سیاست دانوں کی کارروائیاں ہیں جو ایوب خان کے مارشل لاء سے پہلے میدان سیاست کے کھلاڑی تھے۔ بعد میں آنے والے سیاست دانوں نے ان سے کہیں زیادہ اودھم مچایا۔ کسی نے عوام کو روٹی' کپڑا اور مکان کا چکر دیا اور سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے مزدور کو کارخانہ دار سے' کسان کو جاگیردار سے اور کرایہ دار کو مالک مکان سے لڑا کر ملک میں طبقاتی جنگ کا ماحول پیدا کر دیا لیکن خود اپنے اوپر سے جاگیرداری کا خول نہ اتار سکا۔ ان صاحب کی بدترین اور انتہائی نقصان دہ حرکت یہ تھی کہ منافع بخش پرائیویٹ فیکٹریاں قومی تحویل میں لے کر انتہائی کرپٹ اور بدعنوان بیوروکریسی کے حوالہ کر دیں جس سے ملکی معیشت کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ لیکن بھٹو صاحب مزدوروں کی واہ واہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آخر دم تک انہیں مزدوروں اور کسانوں کا ووٹ حاصل رہا۔ بھٹو ذاتی طور پر صدارتی طرز حکومت کے حق میں تھے۔ وہ خود کو اپنے استاد بلکہ منہ بولے باپ ایوب خان کی طرح کا طاقتور صدر بنانا چاہتے تھے لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ اس طرح آئین کو متفقہ طور پر منظور نہیں کروایا جا سکے گا تو انہوں نے پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم کو اس قدر طاقتور کر دیا کہ صدر کا عہدہ محض نمائشی بن کر رہ گیا۔ قصہ مختصر' ان کی تمام جدوجہد اور اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ اقتدار کو اپنی ذات میں مرتکز کیا جائے۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے بے نظیر اور نواز شریف پاکستانی سیاست کے مرکزی کھلاڑی تھے۔ ان صاحب اور محترمہ نے جس طرح کی غلیظ سیاست کی' جمہوری دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

(جاری ہے)

حالات حاضرہ

بابری مسجد کے بارے میں ہندوؤں کا دعویٰ سراسر غلط ہے
مسلمانوں کے خلاف یہود و ہنود کا گٹھ جوڑ پورے عروج پر ہے
بھارت کے مسلمان کمزور نہیں لیکن بھارتی پولیس جانبداری کا مظاہرہ کر رہی ہے
صدر مشرف ملک کو سیکولرائز کرنے پر تلے ہوئے ہیں

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ۸ مارچ 2002ء کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

ایودھیا کی بابری مسجد کے بارے میں ہندوؤں کا دعویٰ سراسر غلط اور تاریخی حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بابری مسجد کی جگہ ماضی میں کوئی مندر موجود نہیں تھا۔ یہ بات امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطاب جمعہ کے دوران کہی۔ انہوں نے کہا کہ بابری مسجد کے حوالے سے بھارت میں حالیہ فسادات کے دوران وہاں کے مسلمانوں پر بہت کڑا وقت آیا ہے لہٰذا ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ بھارت کے مسلمانوں پر سے یہ سخت آزمائش جلد ختم ہو۔ اگرچہ بھارت کے مسلمان کمزور نہیں لیکن ہندو مسلم فسادات کے موقع پر پولیس کی ہندوؤں کی در پردہ پشت پناہی اور خاموش تماشائی کا رول ادا کرنے کے باعث مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ۱۹۹۲ء میں ایودھیا کی بابری مسجد کے حوالے سے پیدا ہونے والی صورت حال کم و بیش وہی ہے جو مشرق وسطیٰ میں مسجد اقصیٰ کی ہے۔ جیسے بھارت میں رام مندر کی تعمیر کے حوالے سے ہندوؤں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے اسی طرح اسرائیل کے انتہا پسند یہودی بھی مسجد اقصیٰ اور گنبد صخریٰ کو گرا کر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے خلاف اس وقت یہود و ہنود گٹھ جوڑ پورے عروج پر ہے۔ تاہم یہودیوں نے اگر بزور قوت کوئی شرارت کرنا چاہی تو مشرق وسطیٰ میں جنگ کی وہ بھٹی دہک جائے گی جس کی لپیٹ میں پورا عالم آ جائے گا۔ یہی وہ جنگ ہے جسے احادیث میں الملحمۃ العظمیٰ اور بائبل میں آرمیگاڈان کہا گیا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ صدر مشرف ملک کو سیکولرائز کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی جگہ ایک محب وطن سپاہی ہیں لیکن انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ملک کو سیکولرازم کی طرف لے جانے کی کوئی کوشش اس کے وجود کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہو گی کیونکہ اس صورت میں ملک کے علیحدہ وجود کا جواز ختم ہو جائے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ملک کی سرحدوں پر دس لاکھ بھارتی فوج جمع ہے اور پاکستان کا دشمن ایڈوانی پاک بھارت کنفیڈریشن کی باتیں کر رہا ہے لیکن ہماری اخلاقی حالت یہ ہے کہ بسنت کے تہوار پر کروڑوں کی فضول خرچی کی گئی اور بے شمار جانوں کے ضیاع کے باوجود ہماری آنکھیں نہ کھلیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہی روش جاری رکھی تو وہ دن دور نہیں کہ جب خود اپنے ملک کے اندر سے بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی آوازیں اٹھنا شروع ہو جائیں گی کہ اگر اسلام صرف نماز' روزے کا نام ہے تو اس کی اجازت تو بھارت میں بھی ہے' لہٰذا الگ ملک کے قیام کی کیا ضرورت ہے؟ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اس خوفناک صورت حال سے بچنے کا راستہ یہی ہے کہ ہم ملک میں اسلام نافذ کر دیں۔ لہٰذا ہمیں اللہ سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ پرویز مشرف کے دل کو بدل دے تاکہ وہ سیکولرازم کی طرف جاری اس سفر کو روک کر ملک میں اسلام کا نظام قائم کریں اور ملک تباہی سے بچ جائے۔

طالبان کیا تھے؟ مستقبل کیا ہے؟

سید وصی مظہر ندوی

مذکورہ بالا عنوان سے امیر جماعت اسلامی پاکستان محترم جناب قاضی حسین احمد کا ایک مضمون روزنامہ جسارت کے ادارتی صفحہ پر تین اقساط میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون نہایت فکر انگیز ہے۔ اس کی تحریر کا مقصد یہ ہے کہ ہر دردمند مسلمان طالبان کے بارے میں حقائق معلوم کرنے کی کوشش کرے اور یہ پتہ چلائے کہ وہ اپنی بے مثال قربانیوں، جانفروشی، شجاعت اور ایمان و یقین کی پختگی کے باوجود کیوں بظاہر اتنی شدید ہزیمت سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ قاضی صاحب کا یہ مضمون ایک اہم ملی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتا ہے کیونکہ بے لاگ احتساب کے بغیر کوئی ملت اپنے مستقبل کے لئے کامیاب لائحہ عمل ترتیب نہیں دے سکتی۔

تاہم قاضی صاحب کے مضمون کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اس مضمون میں حقائق کا معروضی مطالعہ کرنے کی بجائے اس بات کو ترجیح دی گئی ہے کہ قاری طالبان کے بارے میں جماعت اسلامی کی اس پالیسی کو مبنی برحق اور جائز قرار دے جس پالیسی پر جماعت گزشتہ چند برسوں سے عمل پیرا چلی آ رہی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کوشش کی گئی ہے کہ طالبان کی شکست کو تنہا ان کی غلطیوں کا براہ راست نتیجہ قرار دیا جائے۔ شکست کے اسباب میں دوسرے مسلمانوں کا بالعموم اور افغانستان میں کام کرنے والے دیگر مسلم گروہوں کا بالخصوص جو کردار رہا ہے نہایت چابک دستی کے ساتھ اس کی پردہ پوشی کی جائے۔

مضمون کے مذکورہ بالا انداز کی وجہ سے اس اہم تحریر کی افادیت خاصی متاثر ہوئی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے مدعا کو چند مثالوں سے واضح کروں۔

(۱) قاضی صاحب نے امیر المومنین ملا محمد عمر کی اہمیت کو گھٹانے اور افغانستان کے قد آور مجاہد رہنماؤں کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ ملا محمد عمر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ملا محمد عمر چونکہ کوئی معروف شخص نہیں تھا اس لئے غیر متنازعہ تھا اور اس کا کسی سے کوئی قبائلی یا گروہی اختلاف بھی نہیں تھا۔ اس لئے رواداری میں تجویز (ملا محمد عمر کی بیعت کی تجویز) منظور ہو گئی۔ اس طرح طالبان کے ماتحت امارت اسلامیہ افغانستان کی ریاست وجود میں آ گئی۔'' (جسارت ۲۴ جنوری ۲۰۰۲ء)

حالانکہ ایک ایسے وقت جب بلند قامت نمایاں مجاہد لیڈر خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے تھے ان میں سے ہر لیڈر بظاہر اپنے اقتدار کو افغانستان اور افغان قوم کے لئے ناگزیر سمجھنے لگا تھا، باہمی خون ریزی اور بدامنی سے افغانستان مکمل طور پر تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ O.I.C اور دنیا بھر کے مسلمان رہنماؤں اور سربراہوں کی اپیلوں کی طرف افغان مجاہد رہنماؤں نے کوئی توجہ نہ دی تھی حتیٰ کہ جب خانہ کعبہ کے اندر اٹھائے جانے والے حلف اتحاد کو بھی انہوں نے توڑ کر رکھ دیا تھا اس وقت نو امیس فطرت کے عین مطابق ایسا ہی کوئی گمنام مگر انتظامی صلاحیت اور کچھ کر گزرنے کی عزیمت رکھنے والا شخص افغان معاشرے کی رہنمائی کے لئے سامنے آ سکتا تھا کیونکہ کوئی بھی ممتاز مجاہد لیڈر دوسرے لیڈروں کے لئے قابل قبول نہ ہوتا۔ اور ملا محمد عمر نے ۶ سال کے اس بحرانی دور میں قیادت کی اپنی صلاحیت کو بخوبی ثابت کر دیا حتیٰ کہ جب عارضی پسپائی کا فیصلہ کرنا پڑا تو یہ پسپائی بھی غیر معمولی طور پر منظم انداز میں ہوئی۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ تمام مجاہد رہنما اور غلبۂ اسلام کے تمام مخلص علمبردار یکسوئی کے ساتھ ملا محمد عمر کی تائید و حمایت کرتے لیکن ہر شخص کی خود پسندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بحرانی حالات میں قیادت کی ذمہ داری تو ملا محمد عمر نے بخوبی ادا کی مگر افغانستان کی تعمیر و ترقی کے پروگراموں پر عمل درآمد نہ ہو سکا، جو تجربے کار اور منجھے ہوئے قائدین کی نگرانی ہی میں ہو سکتا تھا۔ افسوس کہ ان تجربہ کار قائدین کی انا ملا محمد عمر کے ساتھ تعاون کرنے میں رکاوٹ بن گئی۔ حالانکہ اگر وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے ملا محمد عمر کی سیاسی قیادت کو تسلیم کر کے دیگر تعمیری کاموں میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرتے تو افغان معاشرہ متحد ہو کر افغانستان کو ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کی راہ پر گامزن ہو جاتا۔ مگر بقول محترم قاضی صاحب:

''طالبان کے بہت سے لوگ استاد سیاف، استاد ربانی، یونس خالص، مولوی محمد نبی محمدی اور حکمت یار کے ساتھ ان کی تنظیموں میں رہ چکے تھے۔ ان سب کی خواہش یہ تھی کہ طالبان کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعہ باہمی اشتراک کی کوئی صورت نکل آئے لیکن طالبان کی حالت یہ تھی کہ وہ اس وقت تک کسی کے ساتھ بات چیت کے لئے تیار نہ تھے جب تک ملا محمد عمر کی غیر مشروط بیعت نہ کر لیں۔'' (جسارت ۲۴ جنوری ۲۰۰۲)

اب بتائیے کہ ٹوٹ پھوٹ اور خانہ جنگی کے شکار ایک معاشرے میں سیاسی وحدت اور اکائی کو تسلیم کئے بغیر کوئی اشتراک عمل کیسے ہو سکتا تھا۔ قاضی صاحب کے ان بزرگ رہنماؤں کو سیاسی وحدت میں شامل کئے بغیر اگر اشتراک عمل کی کوئی راہ تلاش کی جاتی تو ۹۰ فیصد افغانستان کی اس سیاسی وحدت کا خاتمہ ہو جاتا جو ۶ سال تک افغانستان پر سایہ فگن رہی۔

جناب حکمت یار اور ان کے ہم خیال مجاہد رہنماؤں کا رویہ تو پھر بھی قابل برداشت ہے کہ وہ کم از کم خاموش ہو کر بیٹھ رہے لیکن استاد ربانی کو دیکھئے وہ کس طرح شمالی اتحاد کے قاتل گروہ اور روس کے پٹھوؤں کے ماشاء اللہ اس وقت تک صدر بنے رہے جب تک اسلام دشمنوں نے اپنی سرپرستی میں ان کو پھر کابل کے تخت پر لا کر نہ بٹھا دیا۔

لیکن افسوس کہ روس جو ان کو افغانستان کے صدر کی حیثیت سے خطاب کرتا تھا ان کی معزولی کے وقت ذرا بھی ان کے کام نہ آیا۔ اور اب یہ خبر بھی آ چکی ہے کہ موصوف کو کابل سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔

یقیناً ملا محمد عمر کو افغان قوم کے ۹۵۔۹۰ فیصد عوام کی تائید حاصل تھی۔ اگر ان مجاہد رہنماؤں کی راہ میں ان کی انا رکاوٹ نہ بنتی تو ان کو خوشدلانہ تعاون کا یک طرفہ فیصلہ کرنا چاہئے تھا جو اسلامی تعلیمات کا بھی تقاضا تھا۔ خوشدلانہ تعاون کے بعد طالبان کی صفوں میں ان مجاہد لیڈروں کی اہمیت کو بالعموم تسلیم کیا جاتا اور ان کو اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اسلامی امارت افغانستان کی خدمت کا بھرپور موقعہ ملتا۔ مگر وہ تو شراکت اقتدار کا فارمولا تلاش کرتے رہے۔ یہ طالبان کی سیاسی بصیرت تھی کہ انہوں نے تعاون کے لئے اقتدار میں شراکت کا کوئی فارمولا بھی غور و فکر کے قابل نہ سمجھا۔

ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کرنے والی مجلس پر قاضی حسین احمد صاحب نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

جس مجلس میں ملا محمد عمر کی بیعت کی گئی اس مجلس کو پوری افغان ملت کی نمائندہ مجلس قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' (جسارت ۲۴ جنوری ۲۰۰۲ء)

لیکن اس کے نمائندہ مجلس ہونے کا دعوے دار کوئی نہیں تاہم محترم قاضی صاحب نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ:

''علماء کا ایک کنونشن تھا۔''

نیز یہ کہ اس بیعت کے بعد

''افغانستان اور پاکستان کے علماء نے ان کی

حمایت کردی۔''

بلاتشبیہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والی سقیفہ بنی ساعدہ کی مجلس بھی نمائندہ مجلس نہ تھی مگر تمام مسلمانوں نے خوشدلی کے ساتھ بیعت کرلی اور یہ بیعت منعقد کی گئی۔

خود قاضی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں اعتراف کیا ہے:

''علماء کی بھرپور تائید کے نتیجہ میں طالبان کو بنیادی انتظامی ڈھانچہ مل گیا جس کے بغیر حکومت کا سکہ نافذ ہونا ممکن نہ تھا۔ یہ ہر گلی اور ہر قریہ موجود تھا۔ مسجد اور مدرسہ سے متعلق ہر شخص اس ڈھانچے کا بے غرض کارکن تھا۔ اس زبردست انتظامی ڈھانچہ کو روحانی پشتیبانی بھی حاصل تھی۔ اس لئے طالبان حکومت لوگوں سے اسلحہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔'' (جسارت ۲۴ جنوری ۲۰۰۲ء)

قاضی صاحب ایک موقع پر تو یہاں تک اقرار و اعتراف کرتے ہیں کہ ''طالبان حکومت کو کوئی اندرونی چیلنج درپیش نہ تھا''

مگر معلوم نہیں کیوں؟ محترم قاضی صاحب اس سارے اقرار و اعتراف کو فراموش کر کے بالکل مخالف ٹریک پر چل پڑے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اگر واقعی افغانستان کے ۹۵ فی صد لوگ ملا محمد عمر کی بیعت کر چکے تھے تو امریکیوں کو محض ڈالروں سے اتنی بڑی تعداد میں ایسے آلۂ کار لوگ نہ ملتے جو مغربی فوج کی بمباری اور گولہ باری کے سایہ میں آگے بڑھ کر اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے پر آمادہ ہوئے۔ درحقیقت طالبان نے ظاہری امن و امان سے یہ غلط نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ افغانستان کے عوام خوش دلی سے ان کے ساتھ ہیں۔'' جسارت ۲۴ جنوری ۲۰۰۲ء

اول تو جناب قاضی صاحب کا یہ دعویٰ بجائے خود محل نظر ہے کہ امن و امان محض ظاہری تھا اور صرف اس کو دیکھ کر طالبان اس نتیجہ تک پہنچ گئے تھے کہ ان کو افغانستان کے عوام کی خوشدلانہ تائید حاصل ہے۔ یہ دونوں دعوے میرے خیال میں حقائق کے خلاف ہیں۔ افغان معاشرہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک آزاد معاشرہ ہے۔ اس میں آج تک کوئی بھی محض طاقت کے بل پر ظاہری امن و امان قائم نہیں کر سکا۔ وہاں کے عوام کے خوشدلانہ تعاون کے بغیر چھ سال تک قائم رہنے والا یہ بے داغ امن و امان برقرار رہنا ممکن نہ تھا۔ آج مغرب کی متحدہ افواج آتش و آہن کے طوفان کے ساتھ پورے افغانستان کو تورا بورا بنانے میں مشغول ہیں اور پرامن اور بے گناہ عام افغان آبادی کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہی ہے لیکن افغانستان میں کہیں امن و امان کا نشان نہیں' حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے امدادی قافلے تاوان ادا کر کے گزرنے پر مجبور ہیں۔

پھر یہ کہنا کہ صرف امن و امان کی بناء پر طالبان کو عوام کے خوشدلانہ تعاون کا پیغام ملا کیونکہ:

(الف) چھوٹے بڑے جرائم کا خاتمہ' (ب) شرعی حدود کی پابندی' (ج) شرعی احکام کا نفاذ' (د) افیون کی کاشت پر مکمل پابندی اور اس پر عمل درآمد (ہ) ہتھیاروں کی واپسی (ز) امریکی حملے اور ہزیمت کے وقت بھی کسی طرف سے بغاوت نہ ہونا' (ز) زبردست انعامات کے امریکی اعلانات کے باوجود اسامہ اور ملا محمد عمر کے بارے میں کسی اطلاع کا نہ ملنا۔

ان میں سے کونسا ایسا کام ہے جو خوشدلانہ تعاون کے بغیر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں اب طالبان کو جب جنگی حکمت عملی کے تحت مکمل پسپائی اختیار کرنی پڑی تو عوام کے دلی تعاون کے بغیر وہ اپنی اہم مادی اور انفرادی قوت کیسے بچا کر لے جا سکتے تھے۔

آخر میں جناب قاضی صاحب کی اس غلط فہمی کو بھی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کا معاشرہ افغانستان کی طرح کی وحدت و فکر و عمل سے محروم ہے..... وہاں ۹۰ فیصد علماء اور عوام ایک مسلک اور ایک ہی فقہی کتب سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ پاکستانی معاشرے میں دنیوی مفادات کی طلب اور سیاسی قوت حاصل کرنے کی لالچ میں علماء فرقہ وارانہ تعصب بڑھانے میں مشغول ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اختلاف اور تعصب کی یہ خلیج جتنی وسیع ہوگی ان کی قیادت اسی قدر زیادہ مستحکم اور قوی ہوگی۔ اس لئے قاضی صاحب کی یہ سوچ درست نہیں کہ یہاں پر بھی علماء مشائخ اور آئمہ مساجد و خطیبوں کا نظام اسی طرح کسی وحدت فکر و عمل کا اظہار کرے گا جیسا کہ افغانستان میں اس قیادت نے طالبان کا غیر مشروط ساتھ دیا۔

میں جانتا ہوں کہ قاضی صاحب کے مداح اس سلسلہ میں علماء کے ان متحدہ محاذوں کا ذکر کریں گے جن میں بظاہر ہر قسم کے اختلافات کے باوجود علماء جمع ہیں لیکن یہ اتحاد سیاسی مقاصد کے لئے محض ظاہری اتحاد ہے۔ ورنہ بقول سید منور حسن جنرل سیکریٹری جماعت اسلامی کہ ''ایسے اتحادوں میں متحد ہونے والی پارٹیاں ہمہ وقت اپنی اتحادی پارٹیوں کو کہنی مار کر ہمیشہ خود آگے اور دوسروں کو پیچھے ڈالنے کے چکر میں رہتی ہیں۔''

البتہ فرقہ وارانہ مسئلے میں طالبان کی پالیسی پر جناب قاضی صاحب کا اعتراض بڑی حد تک درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام میں جس وسعت قلب کی ضرورت ہے اس کا مظاہرہ طالبان نہ کر سکے۔

ایک خواب' ایک حقیقت

ایک بھیانک خواب جو آج حقیقت بن کر سامنے آ رہا ہے

۱۰ اکتوبر ۲۰۰۰ء کی رات کو میں نے یہ خواب دیکھا تھا لیکن آج بھی شعوری طور پر میں اس کی تلخی محسوس کرتی ہوں۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے لگتا ہے کہ یہ خواب مزید حقیقت بن کر سامنے آ رہا ہے ـــــ مذکورہ رات میں نے دیکھا کہ ہماری مسجد میں فوجی بوٹوں والا یہودی آ گیا ہے۔ مسجد سے مراد میری خواب میں بھی کوئی خاص مسجد نہیں تھی۔ نمایاں نظر آنے والی چیز فوجی بوٹ تھے جو اس نے پہنے تھے۔ وہ مسجد کے برآمدے میں ڈٹ کر بیٹھا تھا' یہ چیز بھی خاص طور پر میں نے محسوس کی۔ اس کی پشت کمرے کی طرف یعنی خانہ کعبہ کی طرف تھی منہ صحن کی طرف تھا' دروازہ صحن کی طرف کھلتا تھا۔ مسجد ویران تھی' لیکن وہ فوجی بوٹوں والا یہودی اسی طرح جما بیٹھا تھا۔ پھر اچانک منظر بدلا' میں نے دیکھا کہ ہم لوگ مسجد سے نکل رہے ہیں لیکن دروازے سے نہیں بلکہ فوجی یہودی کے بائیں جانب اونچائی پر ایک کھڑکی کھلی ہے۔ اس پر چڑھ کر ہم باہر نکل رہے ہیں۔ باہر جہاں ہم اترے وہ تنگ اندھیرے والی جگہ تھی۔ سڑک اونچی نیچی تھی دونوں طرف کچھ پہاڑ ہیں اور اونچائی ہے۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد مجھے خیال آتا ہے کہ ایک طرف اناج اور کپڑوں کے ٹرک کھڑے ہیں ہم وہاں سے راشن وغیرہ لے جائیں' نجانے بھوک کی وجہ سے ہمارا کیا حال ہوگا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ بقیہ رات مجھ پر ہیبت طاری رہی۔ اگلے دن بھی خواب حواس پر چھایا رہا ـــــ آج میں سوچتی ہوں کہ یہ خواب کس طرح حقیقت بن گیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے چیلے چانٹے کس طرح ہماری پاک مسجد یعنی پاک سرزمین پر اپنے عزائم پورے کر رہے ہیں۔ مسجد کی ویرانی بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کچھ اللہ کے دین کے سپاہی امریکہ کو دیئے جا چکے ہیں۔ کچھ جیل کے پیچھے ڈال دیئے گئے۔ موجودہ حالات میں یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس راہ میں استقامت دے۔ ایمان کی ایسی دولت دے جو بلالؓ' خبابؓ' سمیہؓ یاسرؓ کو عطا کی جو حضرت اسماءؓ' حضرت خنساءؓ کو عطا کی۔ آمین یارب العالمین!

ایک رفیقۂ تنظیم

امریکہ میں شائع ہونے والی ایک چشم کشا کتاب

"FORCING GOD'S HAND"

کی تلخیص (دوسری و آخری قسط)

یروشلم

دنیا میں مکمل حصار بند شہر Walled city کی چند ہی مثالیں باقی رہ گئی ہوں گی۔ ان میں ایک یروشلم ہے۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ پرانا حصار بند شہر اپنی پوری طویل تاریخ میں بیشتر عربوں سے ہی آباد رہا ہے۔ پرانے شہر کے نوے فیصد بازار' مکانات' مذہبی مقامات' سب عربوں کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یروشلم دنیا کا ایک قدیم ترین شہر ہے' عرب چار پانچ ہزار سال قبل یہاں آئے تھے۔ اوائل میں وہ شالم Shalem نامی خدا کی پوجا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس مقدس شہر کا نام یروشلم پڑا' پھر جب کنعانی آئے تو انہوں نے اسے خدائے واحد کی عبادت کا مرکز بنایا۔ یہ ساری تاریخ یہودیوں کی یہاں آمد سے کئی سو سال پہلے کی ہے۔ عبرانیوں Hebrews کا جو پہلا قبیلہ یہاں پہنچا تھا اس نے چار سو سال سے بھی کم عرصہ یہاں قیام کیا۔ مسلمان کہتے ہیں کہ یہودیوں سے مذہب کی بنا پر ان کا کبھی جھگڑا نہیں رہا' یہودی اور عیسائی جن جگہوں کا احترام کرتے ہیں وہ ہمارے لئے بھی قابلِ احترام ہیں' جن نبیوں کا یہودی اور عیسائی احترام کرتے ہیں ہم بھی ان کا احترام کرتے ہیں' مگر اقتدار کا جہاں تک تعلق ہے' عبرانی یہاں ساٹھ سال سے زائد کبھی اقتدار میں نہیں رہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں اپنی طرز کی ایک امریکی ہوں' واقعہ یہ ہے کہ میں نے یروشلم یا فلسطین کی تاریخ کبھی نہیں پڑھی' ہمارے پاس بائبل کی پرانی کہانیاں ہیں یا آج کی خبریں' جن کی رو سے یہودی دعویٰ کرتے ہیں کہ یروشلم پر ان کا بلاشرکت غیرے مستقل حق ہے۔ میرے لئے یہ بات پریشان کن تھی۔ میں فال ویل (Falwell) کے ساتھ دو بار فلسطین گئی تھی' لیکن ہمیں کبھی یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ بھی اسی سرزمین پر پیدا ہوئے' یہاں انہوں نے تبلیغ کی اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ سارا زور اسرائیل پر ہوتا ہے۔ میں نے سوچا یہاں عیسائی بھی تو ہیں' ان کا کبھی ذکر نہیں آتا۔ ایک فلسطینی عیسائی سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ہم حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ سے یہاں آباد ہیں لیکن ہم کسی کو نظر نہیں آتے' مغربی عیسائی محققین کو اس کی داد دینی چاہئے۔ یہ کایا پلٹ عیسائی مذہب میں 'انقلاب' Reformation کے بعد ہوئی ہے' پہلے فلسطین میں یہودیوں کی واپسی عیسائیت کی تعلیم کا حصہ نہیں تھا۔ نہ ان کے "برگزیدہ نسل" Chosen People ہونے کا تصور تھا۔ سولہویں صدی تک یہی تعلیم تھی کہ یہودی مذہب کا تعلق مسیحی چرچ سے ہے لیکن اس کے بعد یہودیت اور صیہونیت کا دور آ گیا۔ یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں نے کہیں زیادہ عرصہ فلسطین میں گزارا ہے اس کے باوجود عیسائی بنیاد پرست انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں اور فلسطین کی ساری تاریخ کو سمیٹ کر اس مدت تک محدود کر دیتے ہیں جو یہودیوں نے یہاں گزاری ہے۔ جب 'مذہبی انقلاب' کے زمانہ میں مذہبی یہودیوں Biblical Hebrews کا

تلخیص و ترجمہ: سردار اعوان

عیسائی ہم مذہبوں کے ساتھ ملاپ ہوا تو پروٹسٹنٹ عیسائیوں پر یہ راز افشاء ہوا کہ یہودی فلسطین میں جمع ہو کر عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد کی راہ ہموار کر سکتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب تاریخ میں تحریف کا عمل شروع ہوا۔

حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد کی راہ "ہموار" کرنے سے عیسائی اور یہودی یہ مراد لیتے ہیں کہ مسجد الاقصیٰ کا گرانا اور اس جگہ پر ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا ضروری ہے۔ ۱۹۹۹ء کے اوائل میں ڈینور' کولوریڈو کے ایک گروپ کو جو Concerned Charistian "فکرمند عیسائیوں" کے نام سے جانے جاتے ہیں' اسرائیلی پولیس نے گرفتار کر کے واپس امریکہ بھجوایا کہ وہ حضرت مسیحؑ کے دوبارہ ظہور کو قریب لانے کے لئے ایک "خونی تباہی" کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

میں اپنی اس تشویش کا اظہار کرتی ہوں جو مجھے اسلامی عبادت گاہ کو تباہ کرنے سے متعلق ہے' اس سے تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی لیکن راسخ العقیدہ یہودیوں اور ان کے ہم نوا عیسائیوں کی رو سے یہ ایک مقدس جنگ ہوگی جو حضرت مسیحؑ کو مجبور کر دے گی کہ وہ آ کر مداخلت کریں۔ واشنگٹن میں Terry Reisenhoover جو 'اوکلا ہوما' کا رہنے والا ہے' سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا' یہودیوں کے لئے چندہ جمع کرو تا کہ وہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو تباہ کریں۔ روزن ہوور کو ریگن کے دور میں اکثر وائٹ ہاؤس بلایا جاتا تھا جہاں 'نجات شدہ' عیسائی جمع ہوتے' ۱۹۸۵ء میں وہ جیوش کرسچن تعاون کے لئے امریکی فورم کے صدر رہے تھے۔ ایک امریکی ربی' David Ben Ami جس کا ایریل شیرون سے دوستانہ تھا' ان کے قریبی معاون تھے۔ Stanley Goldfoot جیسے عالمی دہشت گرد کو' جو خدا کو نہیں مانتا' مگر اسرائیل کا پورے فلسطین پر قبضہ کرانا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے' فاؤنڈیشن کا انٹرنیشنل سیکرٹری بنا دیا گیا۔

ایک ممتاز شخصیت James E.Deloach سے جو ہوسٹن کے بہت بڑے 'سیکنڈ بپٹسٹ چرچ' کے اہم رکن ہیں' میں نے پوچھا کہ اگر یہودی 'دہشت گرد' جن کی وہ مدد کرتے ہیں' مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو تیسری عالمی جنگ نہیں شروع ہو جائے گی اور دنیا ایٹمی تباہی کی لپیٹ میں نہیں آ جائے گی؟ ان کا جواب تھا' جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی خدا کی مرضی ہے۔ حالانکہ اس سے قبل اکثر بنیاد پرست مبلغین نے جن میں ۱۹۳۰ء کے عشرے کے James M Gray, Arnold C. Gaebelein اور Gerald B Winrod جیسے بنیاد پرست عیسائی مبلغ شامل ہیں اپنے پیروکاروں کو ہمیشہ یہی سبق سکھایا ہے کہ دنیا کے سارے مصائب کے ذمہ دار یہودی ہیں۔ مگر ۱۹۴۰ء کے عشرے میں جب یہودیوں کے خلاف ہٹلر نے نسل کشی کی مہم شروع کی تو وہ بنیاد پرست جو صیہونیت کی مخالفت میں سرگرم تھے' مخالفت سے الگ ہو گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ دینیات کے پروفیسر اور Presbyterian Minister (پادری) Donald E.Wagner جیسی شخصیات نے فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو کاروباری لحاظ سے نفع بخش قرار دیا اور کہا کہ یہ محض اتفاق نہیں کہ یہودیوں اور برطانوی دفتر خارجہ کے سیاسی مقاصد میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ شروع کے بنیاد پرستوں میں سے ایک برطانوی مخیر Lord Shaftesbury نے کہا کہ فلسطین میں انگریزوں کے زیر کنٹرول یہودیوں کے ایک مضبوط مرکز کے قیام سے مشرق قریب میں برطانیہ کو فرانس پر سبقت حاصل ہو جائے گی' اسے ہندوستان کے لئے براہ راست زمینی راستہ مل جائے گا اور اس کے معاشی مفادات کے لئے وسیع مارکیٹ ہاتھ آئے گی۔

جو شیلے یہودی لیڈروں اور عیسائی بنیاد پرستوں نے اس بات پر اتحاد کر لیا ہے کہ وہ ایک ہی کلیہ پر عمل کریں گے۔ یہ کلیہ روحانی اقدار اور پاکیزہ زندگی گزارنے سے

نہیں' زیادہ سیاسی اقتدار اور مالی مفادات کے حصول سے متعلق ہے' گویا مذہب کے نام پر یہ گروہ مجنونانہ طریقے سے اپنے خودغرضانہ مقاصد کے لئے کام کر رہا ہے۔ ڈینور (کولوریڈو) میں ایک بنیاد پرست مسیحی لیڈر Douglas Krieger کا ٹیری ہوور کے ساتھ یروشلم میں مسجد گرا کر اس کی جگہ ہیکل کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کرنے سے گہرا تعلق ہے۔ Krieger کا خیال ہے کہ اسرائیل فوجی لحاظ سے جتنا زیادہ طاقت ور ہوگا' اتنا ہی اسے امریکہ کا قرب حاصل ہوگا کیوں کہ طاقتور' طاقتور کا دوست ہوتا ہے۔

چیدہ چیدہ

جنوری ۱۹۹۸ء میں فال ویل نے وزیراعظم نیتن یاہو اور اسرائیل کے مسیحی حلیفوں کے درمیان ایک ملاقات کا اہتمام کیا۔ عیسائیوں نے اس موقع پر عہد کیا کہ وہ کلنٹن انتظامیہ کے خلاف دوسرے عیسائیوں کو متحرک کریں گے تاکہ اسرائیل پر فلسطینی علاقہ خالی کرنے کے لئے دباؤ نہ ڈالیں۔

۱۹۹۸ء میں John Hagee نے' جو سین انٹونیو میں پادری ہیں' اسرائیل میں روسی یہودیوں کی آبادکاری کے لئے دس لاکھ ڈالر اکٹھے کئے اور اس سوال کے جواب میں کہ کیا ایسا کرنا بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی نہیں' ان کا کہنا تھا کہ میں بائبل کا اسکالر ہوں' میری بصیرت کی رو سے خدا کا قانون امریکی حکومت اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے قانون سے بالاتر ہے۔

۱۹۹۸ء میں صدر کلنٹن نے امریکی نژاد یہودی Jonathan J.Pollard کو امریکی راز چرانے پر دی گئی سزا معاف کرنے کا امکان ظاہر کیا تو اس نے صاف اقرار کیا کہ میں نے یہ کام اپنی ریاست (اسرائیل) کے مفاد میں کیا تھا۔

۲۵ فروری ۱۹۹۹ء کو اسرائیل کی سپریم کورٹ نے فیصلہ صادر کیا کہ کسی یہودی کو جو پناہ کی غرض سے اسرائیل آ گیا ہو' مقدمہ چلانے کی غرض سے امریکہ کے حوالہ نہیں کیا جائے گا' باوجود اس کے کہ اسرائیل اور امریکہ کے درمیان مجرموں کے تبادلہ کا معاہدہ موجود تھا۔

کرسچن رائٹ کی بعض پالیسیوں سے آزاد خیال یہودیوں کے اختلاف کے باوجود ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ترجیح اوّل اسرائیل کے وجود کو حاصل رہے گی۔ مثلاً یہودیوں کو عیسائیوں کا یہ عقیدہ معلوم ہے کہ تمام یہودی بالآخر حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لے آئیں گے یا پھر وہ ہلاک کر دیئے جائیں گے لیکن یہودی کہتے ہیں جب وہ وقت آئے گا' سوچ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ اسی طرح جب کوئی عیسائی مبلغ کہتا ہے کہ خدا یہودیوں کی مناجات نہیں سنتا' تو وہ کہتے ہیں یہودیوں کو کیا پڑی ہے کہ ایک مبلغ کی دینیات پر دھیان دیں جبکہ وہ ایک پل کو بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ مبلغ خدا کی توجہ کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا حق رکھتا ہے' خاص کر جبکہ وہی مبلغ اسرائیل کی حمایت بھی کرتا ہو۔

اسرائیل کو دی جانے والی مجموعی امریکی امداد کبھی نہیں بتائی جاتی' غالباً اس لئے کہ وفاق کی دوسری ریاستیں اس پر اعتراض نہ کریں۔

بنیاد پرست عیسائی مبلغ' جیری فال ویل نے ۱۹۶۷ء تک کبھی اسرائیل کا نام نہیں لیا تھا۔ اسرائیل کی اہمیت کا راز اس وقت اس پر ''افشاء'' ہوا جب اسرائیلیوں نے فال ویل کو اپنے ہاں مدعو کیا اور ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں نیویارک میں ایک پُرشکوہ ڈنر کا اہتمام کیا گیا جس میں بیگن نے اسرائیل کا اعلیٰ ترین ایوارڈ فال ویل کی خدمت میں پیش کیا۔ ایک جیٹ طیارہ' جس کی مالیت ۲۵ سے ۳۵ لاکھ ڈالر ہوگی' اسرائیل نے اسے دیا ہے۔ فال ویل بڑے فخر سے کہتا ہے کہ میں ہر ہفتے اس جیٹ میں دس ہزار میل کا سفر کرتا ہوں۔

ابلاغیات

پاک امریکہ دوستی ـــــ اہل صحافت کی نظر میں

☆ ''جنرل پرویز مشرف کے ہمراہ امریکہ جانے والے وفد کے ارکان میں وفاقی وزیر تجارت عبدالرزاق داؤد اور میجر جنرل راشد قریشی بھی شامل تھے۔ پاکستانی وفد کی نیویارک کے ہوائی اڈے پر جامہ تلاشی لی گئی اور ساتھ ہی جوتے بھی اتروائے گئے۔ امریکی حکام کی پاکستانی وفد کے ارکان کے ساتھ مذکورہ بدسلوکی پوری قوم کے لئے شدید دکھ کا باعث بنی ہے۔'' یہ جناب احمد ندیم قاسمی کے جذبات ہیں' جنہیں روزنامہ جنگ نے شائع کیا۔

☆ ''امریکہ نے افغانستان میں مشرف حکومت کے بھرپور تعاون کے باوجود پاکستان کو اپنا قابل اعتماد اور طے شدہ اتحادی نہیں مانا۔ بلکہ امریکی کانگریس کی جانب سے پاکستان کی نیک چلنی کی مسلسل نگرانی کا اعلان ثابت کرتا ہے کہ امریکہ مرحلہ بہ مرحلہ ہمارے ساتھ سودے بازی کرے گا۔ مجھے لگتا ہے مشرق وسطیٰ میں جس طرح امریکہ اور اسرائیل اصل اتحادی ہیں' اسی طرح جنوبی ایشیاء میں امریکہ اور بھارت اصل اتحادی ہیں۔ جس طرح امریکہ نے پہلے پہل یاسر عرفات کا ہمدرد بن کر انہیں فلسطینی قوم سے لڑنے کے راستے پر ڈال دیا اسی طرح وہ پاکستان میں بھی کرنا چاہتا ہے۔'' ان خدشات کا اظہار جناب نذیر ناجی نے اپنے کالم ''سویرے سویرے'' میں کیا۔

☆ ''دہشت گردوں اور دہشت گردی کے خلاف ''کولیشن'' کی اصطلاح سراسر بوگس ہے کیونکہ اس نام نہاد ''عالمی اتحاد'' کی آڑ میں دراصل امریکہ ہی تن تنہا واردات ڈال رہا ہے جبکہ باقی سارے کے سارے نام نہاد ''اتحادی'' امریکہ کے ایسے ہمنوا ہیں جیسے کسی مشہور قوال کے اردگرد تالیاں بجانے والے۔ اگر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی بجائے چین' جاپان' روس' برطانیہ' جرمنی' فرانس میں کسی اہم ترین بلڈنگ کے ساتھ یہی سلوک ہوتا تو کیا دنیا اسی طرح تبدیل ہوتی جیسے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد ہوئی ہے۔ انکل سام اب انکل سام ہی نہیں رہا بلکہ ''فادر سام'' بن چکا ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد پوری دنیا کے لئے امریکہ ''گرینڈ فادر سام'' کا کردار ادا کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ساری دنیا ''جرم ضعیفی کے بعد مرگ مفاجات'' سے بچنے کے لئے ''عالمی اتحاد'' جوائن کر چکی ہے' جو عالمی نہیں درحقیقت صرف اور صرف ''امریکی اتحاد'' ہے یعنی امریکہ ''عزیز میاں قوال'' ہے اور باقی سب ''ہمنوا''۔ یہ خیالات جناب حسن نثار کے ''چوراہے'' کی زینت بنے۔

☆ ''سوال یہ ہے کہ جو سلوک عبدالرزاق داؤد اور میجر جنرل راشد قریشی سے نیویارک ایئرپورٹ پر کیا گیا ہے وہ کسی بھارتی وزیر یا جنرل سے ہوتا تو کیا بھارتی حکومت اسے برداشت کر لیتی۔ امریکی حکام ہر ملک کی اوقات دیکھ کر اپنا رویہ متعین کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آئندہ امریکی ہوائی اڈوں پر متعین عملے کو ہدایت دے دی جائے کہ آئندہ سے پاکستان کے وزیروں اور جنرلوں کے جوتے اتروانے کی بجائے ان ''معزز'' مہمانوں کے لئے امریکہ ساختہ نئے جوتے جہاز کے اندر بھیج دیئے جائیں تاکہ سرعام رسوائی سے تحفظ ہو سکے۔'' یہ الفاظ جناب عباس اطہر نے اپنے کالم ''کنکریاں'' میں تحریر کئے۔

ندائے خلافت کے باخبر قارئین کے لئے یہ چند اقتباسات نقل کئے گئے ہیں تاکہ پاکستان کی ''دانشور'' حکومت کو بے شرمی کی آخری حدوں کو پار کرنے سے باز رکھا جا سکے۔ ذرا سی ترمیم کے ساتھ اقبال کے الفاظ میں حکمرانوں سے یہی گذارش ہے کہ:

تو اگر ''قوم'' کا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!

(انتخاب: نعیم اختر عدنان)

موجودہ عالمی حالات میں اسلام کے نظام عدل وقسط کو لوگوں کے سامنے اجاگر کرنے کی زیادہ ضرورت ہے

تنظیم اسلامی پنجاب وسطی کے امیر کا محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے نام خط

محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلکم العالی
سلامت وشگفتہ باشید

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ گزشتہ خطبات جمعہ (۲۵ جنوری اور یکم فروری) میں جہاد کے موضوع پر آپ کے ارشادات مختصر ہونے کے باوجود مدلل اور وقیع تھے۔ ندائے خلافت میں شائع شدہ خلاصہ بھی کافی لوگوں کو پڑھنے کے لئے دیا اور خطاب جمعہ کے آڈیو کیسٹ بھی کافی تعداد میں اہل علم وفضل کو سننے کے لئے دیئے۔

آپ نے جہاد کے ضمن میں اسلام کے غلبے کے لئے جدوجہد اور نتیجتاً قتال کو "فی سبیل اللہ" کا مصداق فرما کر اعلیٰ درجہ فرمایا ہے اور بالکل بجا ہے۔ پھر اسلام کی توسیع کے ضمن میں صحابہ کرامؓ کی تین شرائط کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ بات بھی یقیناً قرآن وحدیث سے ثابت ہے گویا پڑوسی ممالک سے اسلام کی دعوت اور مطیع وفرمانبردار بن کر رہنے سے انکار کی صورت میں جنگ لازمی ہے۔

مرورِ زمانہ اور علم وعمل کے زوال کے نتیجے میں مغرب کو بالادستی حاصل ہوئی اور آج وہ ہمیں یہی تین شرائط پیش کرنے کی پوزیشن میں ہے بلکہ پیش کر چکا ہے۔ اولاً ہم اس کا مذہب اختیار کر لیں (جیسا کہ ہمارا مغرب زدہ طبقہ کر رہا ہے)۔ ثانیاً ہم چھوٹے بن کر رہیں (جیسا کہ اس وقت مسلمان حکومتوں کا عمومی رویہ ہے) یا ثالثاً مقابلے کے لئے تیار ہو جائیں (جس کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں یا ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے)۔

صدر بش کا صدر پرویز کو فون پر دوست یا دشمن کی دھمکی دراصل آخری دو شرائط ہی کا خلاصہ تھی۔ یعنی چھوٹے بن کر رہو یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اگرچہ دور ملوکیت میں مسلمان بادشاہوں اور شہنشاہوں نے بھی یہی کچھ کیا ہے جو آج مغرب (امریکہ اور اس کے اتحادی) تیسری دنیا کی پس ماندہ اقوام کے ساتھ کر رہے ہیں تاہم خلافت راشدہ میں ایسا نہ تھا اور اسلام کا حقیقی مزاج بھی ایسا نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ اسلام کا حقیقی مزاج کیا ہے؟ اور دور خلافت میں اسلام کی تبلیغ کیا تھی؟ اور چھوٹے بن کر رہنے میں بھی غیر مسلموں کو "انسانی شرف و وقار" کے کیا درجات حاصل رہے؟ نیز جنگ کی صورت میں بھی خلافت راشدہ یا دور صحابہؓ میں کیا اخلاقی اور روحانی اصول تھے جن کی پاسداری کی گئی جس سے آج کے مغرب کے چیلنج اور طرزِ عمل میں اور ہمارے اسلاف کے طرزِ عمل میں زمین وآسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

میرے خیال میں آئندہ خطباتِ جمعہ میں اسلام کے نظامِ عدل وقسط کو مغرب کے حوالوں سے لوگوں کے ذہنوں میں دوبارہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ رستم کے دربار میں ایک صحابیؓ کا یہ جملہ "انا قد ارسلنا لنخرج الناس من ظلمت الجهالة الى نور الاسلام ومن جور الملوک الى عدل الاسلام" بھی اہمیت کا حامل ہے کہ آج کے الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے دنیا بھر کے ایلیٹ طبقہ کے سامنے یہ فرق زیادہ شدّ ومدّ کے ساتھ آنا ضروری ہے۔

جو عالمی پوزیشن اور شانِ یکتائی امریکہ کو اس وقت حاصل ہے ویسی شان یکتائی (غیر مسلموں کے نقطہ نظر سے ہی دیکھیں) تو کبھی خلافت راشدہ میں مسلمانوں کو بھی ملی تھی تاہم مسلمانوں کا اپنے مدّ مقابل اقوام عالم سے رویہ ان کے عوام سے سلوک، ان کے اموال وجان سے برتاؤ نیز ان کا لایا ہوا Best Governance کا نظام حقیقی طور پر اخوت، مساوات، عدل وقسط کا علمبردار تھا جبکہ آج جس مغرب کو بالادستی کا موقع ملا ہے اس کا مخالفین سے سلوک، حکومتوں سے معاملات، مال وجان سے برتاؤ نیز ان کا نظام سیکولر ڈیموکریسی اور Total Freedom کی بنیاد پر جس قدر بھیانک ہے اور بھیانک نتائج وعواقب کی طرف لے جا رہا ہے اس کا ادراک آپ کو ہم سب سے بہتر ہے اور آپ ہی کو زیب دیتا ہے بلکہ ذمہ داری ہے اس کو بانگ دہل اور واشگاف الفاظ میں واضح بھی کریں اور تقابل کے ذریعے عالم انسانی کے معتدل مزاج اور انصاف پسند لوگوں تک یہ بات پہنچا دیں کہ حقیقی اسلام اور قرآن کی تعلیمات کیا ہیں؟ آپ نے پہلے بھی یہی کام کیا ہے اور کر رہے ہیں تاہم اس خاص عالمی تناظر (Scenario) میں یہ کام موجودہ ظروف احوال اور اصطلاحات کا سہارا لے کر ایک بار پھر دہرانے کی ضرورت ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے لئے انشراحِ صدر عطا فرمائے اور ہمت اور توفیق دے کہ یہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ ادا کر سکیں۔ شاید کچھ باصلاحیت دل اور باصلاحیت کان آپ کی دعوت پر نرم ہو کر لبیک کہہ سکیں اور آپ کے ساتھ چلنے والوں کے سوز یقین میں اضافہ ہو سکے۔

شکریہ بصد احترام
والسلام مع الاکرام
مختار حسین فاروقی

قرآن فہمی کا ایک اور جدید انداز

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کا بیان کردہ

دورۂ ترجمہ قرآن 98ء

اب VCD (ویڈیو سی ڈی) میں بھی دستیاب ہے

☆ 108 ویڈیو سی ڈیز پر مشتمل ☆ قرآن مجید کے متن کے ساتھ
☆ بہترین آڈیو اور ویڈیو کوالٹی ☆ خوبصورت پیکنگ

قیمت: 4500 روپے

(نوٹ: ان سی ڈیز کو کمپیوٹر اور VCD Player دونوں پر چلایا جا سکتا ہے)

ملنے کا پتہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور**

قرآن اکیڈمی 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-5869501

تنظیم اسلامی ضلع باغ کی دعوتی سرگرمیاں

اگرچہ ضلع باغ میں تنظیم کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن تنظیم اسلامی باغ کے امیر کی ان تھک محنت کے نتیجے میں دفتر میں روزانہ باقاعدہ درس قرآن بذریعہ ویڈیو کیسٹ دکھایا جاتا ہے۔ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات شریک ہوتے ہیں۔

افغانستان میں طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ کشمیر پالیسی' معاشی استحکام اور ایٹمی صلاحیت کے تحفظ کی خاطر پاکستان نے عالمی اتحاد میں شمولیت اختیار کی ہے' لیکن اپنے بھائیوں سے بے وفائی کے نتیجہ میں پہلی سزا تو یہ ملی کہ آزادی کی خاطر جانیں دینے والوں کو دہشت گرد قرار دیا گیا جبکہ کشمیر کاز سے بتدریج پسپائی ہماری حکومت کی غلط حکمت عملی کی عکاس ہے۔ اہل کشمیر یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہم نے جس مقصد کے لئے قربانیاں دی تھیں' آخر وہ مقصد حاصل ہو گا بھی کہ نہیں۔ ان حالات میں سوچنے سمجھنے والے افراد کسی مسیحا کی تلاش میں ہیں۔ ایسے ہی سوالات دفتر تنظیم اسلامی باغ میں اٹھائے گئے جہاں ۱۶ فروری کو بعد نماز مغرب جناب خالد محمود عباسی نے ڈیڑھ گھنٹہ تک خطاب کیا۔ لوگوں کے شوق و اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ نماز مغرب کے فوراً بعد دفتر کھچا کھچ بھر چکا تھا اور لوگ بے تابی سے مقرر کا انتظار کر رہے تھے۔ پروگرام انتہائی کامیاب رہا۔ نماز عشاء کی ادائیگی کے بعد باقاعدہ سوال و جواب کی نشست ہوئی' جس میں موجودہ صورت حال کے متعلق سوالات کئے گئے۔ جناب خالد محمود عباسی نے دل نشیں انداز میں تمام اشکالات کو رفع کیا اور الحمدللہ۔ چار حضرات نے بیعت فارم پُر کر کے قافلۂ تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی۔

اس کے بعد نزدیک سے آئے ہوئے لوگ چلے گئے جبکہ تقریباً پندرہ افراد نے رات وہیں بسر کی۔ صبح بعد نماز فجر درس قرآن ہوا اور ناشتہ کے بعد پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس طرح اس پروگرام نے شب بسری کی صورت بھی اختیار کر لی۔

(رپورٹ: شبیر احمد اعوان)

کراچی میں ''فلسفہ و حکمت قربانی'' کے موضوع پر دعوتی لیکچرز

ہر ماہ کے دوسرے اتوار کو صبح گیارہ بجے تنظیم اسلامی کراچی (شرقی ۱) کے تحت گلشن اقبال میں اور تنظیم اسلامی کراچی (شرقی ۵) کے زیر اہتمام سوسائٹی میں بیک وقت ایک ہی موضوع پر لیکچرز ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا لیکچر ماہ جنوری میں ''حقیقت و مقصد زندگی'' کے موضوع پر دیا گیا تھا جبکہ دوسرا پروگرام ۱۰ فروری کو منعقد ہوا جس کا موضوع ''فلسفہ و حکمت قربانی'' تھا۔ مقررہ دن سے قبل شرکاء میں موضوع سے متعلق ایک پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔

گلشن اقبال میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے جناب اعجاز لطیف نے کہا کہ قربانی دراصل اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ ان آزمائشوں میں سے ایک ہے جو زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں۔ سب سے زیادہ آزمائشیں اللہ کے جس بندے کو پیش آئیں' وہ سیدنا حضرت ابراہیمؑ تھے۔ ان آزمائشوں کا نقطۂ عروج وہ قربانی تھی جس کی ہدایت اللہ نے انہیں خواب کے ذریعے کی اور جس کی تعمیل میں انہوں نے اپنے صاحبزادے سیدنا حضرت اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری پھیر دی۔ یہ وہ آزمائش تھی جسے خود ممتحن یعنی اللہ تعالیٰ نے عظیم قرار دیا۔ ان کی اس قربانی کو قبول کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو زندہ بچا لیا بلکہ ان کی جان کے فدیہ کے طور پر قیامت تک کے لئے جانوروں کی قربانی کا سلسلہ جاری فرما دیا۔ انہوں نے کہا کہ دیگر عبادات کی طرح قربانی کا مقصد بھی تقویٰ کا حصول ہے۔ یہ نہ صرف انفرادی زندگی میں مطلوب ہے بلکہ اجتماعی طور پر معاشرے میں بھی تقویٰ کا غلبہ مقصود ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ باطل نظام کے خلاف اجتماعی جدوجہد کو فرض عین سمجھ کر اس میں شامل ہوا جائے۔ اس پروگرام میں خواتین و حضرات کو ملا کر تقریباً پچاس افراد شریک تھے۔ سوسائٹی میں جناب انجینئر نوید احمد نے لیکچر دیا۔ وہاں شرکاء کی تعداد ایک سو کے قریب تھی۔

(رپورٹ: محمد سمیع)

تنظیمی اطلاع

نائب امیر تنظیم اسلامی نے تنظیم اسلامی کراچی (وسطی ۱) کے امیر جناب اختر ندیم اور تنظیم اسلامی کراچی (وسطی ۲) کے امیر جناب جلال الدین اکبر کی معذرت قبول کرتے ہوئے ان عہدوں پر بالترتیب جناب اظہر ریاض اور جناب سید اشفاق حسین کا تقرر کیا ہے۔

دعائے مغفرت

سنگولہ باغ آزاد کشمیر کے رفیق تنظیم جناب نذیر احمد اعوان کے سسر طویل علالت کے بعد گزشتہ دنوں قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ رفقاء و قارئین سے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وادخلہ فی رحمتک وحاسبہ حسابا یسرا

تنظیم اسلامی کا پیغام
نظام خلافت کا قیام

گوشۂ خواتین

ناظمہ تربیت کا دورۂ کراچی

تنظیم اسلامی حلقہ خواتین کی مرکزی ناظمہ تربیت محترمہ امت المغنی فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے سعودی عرب جاتے ہوئے کراچی تشریف لائیں تو یہاں کی مقامی ناظمات و نقیبات کو ان کے ساتھ ایک نشست کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ نشست بہت اہمیت کی حامل تھی کیونکہ اس میں اس نئے نصاب پر گفتگو کی جانی تھی جو حال ہی میں مرکز کی طرف سے ترتیب دیا گیا ہے۔

تلاوت قرآن کے بعد تمام مقامی ناظمات نے اپنے زیر نگرانی اسروں کی کارکردگی رپورٹ پیش کی اور عمومی و خصوصی پروگراموں کی تفصیل بتائی گئی۔ ناظمہ تربیت نے تمام مقررین کو انتہائی توجہ سے سنا اور اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا' جو ان کی بہترین تربیت کے عکاس تھے۔ اپنی گفتگو کے دوران انہوں نے سب سے زیادہ زور اقامت دین کی فکر کو اجاگر کرنے پر دیا' جس کے تحت نئے نصاب کو تشکیل دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ علم تو ہمیں دوسری جگہوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے مگر اس فکر کا ملنا مشکل ہے۔ اخلاقیات اور اخلاص پر زور دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ریاکاری ایک ایسی چیز ہے جو تمام اعمال صالحہ کو صفر سے ضرب دے دیتی ہے۔ اسی لئے نصاب میں عقائد و نظریات کو تعارف تنظیم کی شکل میں رکھا گیا ہے تاکہ ہر فرد اپنی ذاتی اصلاح سے بے خبر نہ رہے۔ آخرت کے محاسبہ کا سامنا ہر کسی کو تن تنہا کرنا ہے' جماعتی بنیاد پر نہیں۔ اپنی نیت میں اخلاص پیدا کرنا ذاتی طور پر بھی نہایت ضروری ہے اور تحریکی طور پر بھی۔ انا پرستی کسی بھی انقلابی جماعت کے لئے زہر کا کام دیتی ہے۔ انہوں نے تحریک کے پروگراموں میں باقاعدہ شرکت کو بیحد ضروری قرار دیا۔ خصوصی پروگراموں کو فائدہ مند اور پرکشش بنانے کے لئے انہوں نے اسرے میں رفیقات کی تعداد کو کم کرنے کی تاکید کی۔ انہوں نے نقیبات کو تلقین کی کہ وہ اپنے مزاج میں شگفتگی اور نرم مزاجی قائم رکھیں اور رفیقات کے ساتھ ایک ماں کی طرح سلوک کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہر رفیقہ کو بحیثیت ایک عورت اپنے فرائض کو سمجھنا چاہئے۔ اپنے دائرہ کار یعنی گھر اور بچوں کو نظر انداز کر کے کسی بھی نوع کی درس و تدریس ہماری نجات کا سبب نہیں بن سکتی۔

تمام ناظمات و نقیبات نے اس نشست کو بہت اہم' نہایت ایمان افروز اور عمل کے لئے بہترین راہ نما قرار دیا۔ بیشتر کی رائے میں اس قسم کی نشست کو سال میں کم از کم ۲ بار ضرور ہونا چاہئے۔

(رپورٹ: بنت الیقین)

Taliban knew their military disadvantage against the Coalition of the super powers, but they stood for the principle of not handing over someone without any evidence against the accused. Talking in the past tense that the Islamic civilization "was pluralistic and unusually tolerant of various social and religious denominations" doesn't make any sense because Islam is still as much tolerant of various nations and religions. The others, however, are not. Why doesn't any one talk about tolerance in Judaism when dozens of the Palestinians are killed on weakly basis for the last 35 years? Why is the media silent about intolerant Hinduism that relentlessly oppresses Kashmiri civilians for the last 55 years? Why didn't the analysts analyse the intolerant Christianity when 300,000 Muslims were butchered in Bosnia and millions are still facing the wrath of Russians in Chechnya? Why the talk of tolerance is directed at Islam alone? Simply because the victim is the US, or the game was already planned to involve the Muslims without any concrete evidence against them.

In an attempt to please Islam-bashers, Muslims like Abou El Fadl go to the extreme of proving Islam as not the only path to salvation. They quote verses 5:49 and 5:69 in support of their claim. The problem is that such moderate interpreters ignore the crux of Islamic belief while delivering sermons not to read Quran out of context. These above mentioned verses become clear only when read in conjunction with other relevant verses of the Qur'an, for instance, 4:170, 5:16, 21, 7:157-158, 21:107, 25:1, 33:40, 61:6, 2:40, 3:31-32, and 4:150-151. Undoubtedly, Quran accepts the distinctiveness of the Jewish and Christian communities and their laws, while also insisting that Muslims are entitled to the same treatment as those other communities, but it is not mentioned anywhere that all faiths would lead everyone to salvation. Of course, it sets out an expectation of reciprocity for Muslims, but it does not allow them to also follow what the Jews and Christian do and believe. It definitely recognizes the moral worth and rights of the non-Muslims but does not relieve the Muslims of their responsibility to stand for the rights of their oppressed brethren. What crime did the Palestinians, Kashmiris, Chechens, Iraqis and others commit? Did we ever stand for the rights of the Muslims as we are lecturing for the rights, and acceptance as equals, of the Jews and Christian, to prove ourselves tolerant?

It is wrong to assume that the meaning of Quran "is often only as moral as its reader," which means if the reader is intolerant, so will be the interpretation of the text. If the text of the Quran were so fluid that anyone could interpret it according to his interest, it would never have been different book than all the rest from the beginning till the end of time. Mr. Fadl claims that the Qur'an and other Islamic sources "offer possibilities of intolerant interpretation." Actually, it depends, on whom the interpretation is being applied. The clear injunction of fighting an oppressor would certainly be considered an "intolerant interpretation" by an oppressor. And those, who make the people aware to stand up and face the oppressor, would definitely be considered by the oppressor as "puritans and supremacists" exploiting the Quran. It is not the reading that makes interpretation intolerant; it is, in fact, application of the Quran to real life situation, which makes the life harder for the intolerant oppressors. If the text does not command "intolerant readings", so it prohibits tolerating injustice and repression of the innocents. Historically, Islamic civilization has displayed, and is still displaying, a remarkable ability to recognize possibilities of tolerance, and to act upon these possibilities. The so dreaded Islamic super powers and non-powers remained silent while 300,000 Bosnian Muslims were being butchered with a tight arms embargo in place on them for self-defence. The intolerant Coalition of the mighty, however, attacked to dislodge the Taliban without producing a shred of evidence about their involvement. On the other hand, everyone participating in the revengeful war on Afghanistan is tolerating the daily bloodbath of the Palestinians for the last 35 years in a so visible display of double standards.

It is not "the modern puritans," dissipating and wasting an inspiring moral tradition of Islam; it is the modern world leaders who are taking advantage of the Islamic tolerance to further force them into subservience, so that they may not only surrender their right to stand for their oppressed brothers and sisters but also the right to call for justice because a tolerant interpretation of Islam doesn't demand it. The Quranic interpretation has never gone wrong, except where it hurts the interest of the merciless and mighty oppressor. The burden of sustaining the limits of tolerance in Islam falls squarely on the shoulders of the giants who usurp rights of the Muslims, consider them as second-class citizens of this planet and sustain the rule of their oppressors in different ways.

John L. Esposito, director of the Centre for Muslim-Christian Understanding at Georgetown University, highly appreciated Mr. Fadl's write up and added, the Muslim extremists "transform Islam's norms and values...into a call to arms, in order to legitimate the use of violence, warfare, and terrorism." Mr. Esposito forgets that it is simply a call to self-defence against the never-ending terror. If there were no action, there would be no reaction. Islam simply happens to be the religion of the oppressed and those fighting for their rights in the absence of all political options. Blaming them for wrong interpretation, discussing tolerance in Islam and making them even more tolerant of the oppression is not the solution. Islamic teachings and the Muslims would have been more tolerant today, only if the laws that apply to the Iraqis were also applicable to the Israelis; if the laws that apply to those who die in WTC were also applicable to those who died in Afghanistan; if the universal principles applied to Kuwait and East Timor were applicable to Palestine and Kashmir. Intolerance would forever begets intolerance; regardless of any religion or people. And the sermons of tolerance may not help the West treat Muslims as second rate people for ever.

★★★★★

Abid Ullah Jan
(E-mail: abidjan2@psh.paknet.com.pk)

The Limits of Tolerance in Islam.

Even worse than the death of 2,800 civilians at WTC is the tragedy of openly holding Islamic teachings or Muslims responsible for every kind of terrorism, intolerance and extremism in the world. The years long anti-Islam campaign, spearheaded by a few American analysts until September 11, has suddenly become mainstream and many Muslims have proudly joined their ranks in criticising Islam with new slogans and terminologies. Gone is the issue of finding the real evidence and culprits behind September 11 incident. Top on the agenda, however, is the place of tolerance in Islam and compatibility of this faith to the contemporary world.

Opportunist Muslim opinion makers are leading the pack of so-called moderate intellectuals, pretending to be bridging the ever-widening gap between Islam and the West. Khaled Abou El Fadl, fellow at University of California at Los Angeles, for instance, wants the Muslims to interpret the Quran in the context of ancient historical facts, but at the same time consider terrorism as an isolated phenomenon, independent of any historical or political context. Collectively, the cacophony of voices in the western media presents just one reason for the troubles around the world: Islam.

Analysts like Abou El Fadl believe, the intolerant Muslims consider Islam as "the only way of life," which "must be pursued regardless of its impact on the rights and well-being of others," (Boston Review January 2002). Such sweeping statements give the wrong impression that pursuing Islam is not only optional, but also harmful to those who believe in other ways of life, and that the Muslims, for the comfort and satisfaction of others, must deviate from the straight path because "that trump any moral considerations or ethical values that are not fully codified in the law." Ignoring the reality of how actively the US is seeking to impose its way of life on others, these analysts complain that the "supremacist Muslim puritans" are "not satisfied with living according to their own dictates," but "aggressively seek to disempower, dominate, or destroy others." An in-depth analysis of the facts, however, reveal that the continuing world troubles are simply due to the reality which is the other way round - i.e., the US and its allies seeking their objectives to dominate or destroy. Unfortunately, the words that Mr. Fadl used -- control, dominate and destroy -- belong to Pat Robertson (February 21, 2001) when he made his attempt to demonise Islam, without getting labelled as "supremacist Christian."

As far responsibility for intolerance and quest for dominance is concerned: Did the "supremacist Muslim puritans" initiate the troubles in Algeria? Are the Muslim "fundamentalists" occupying non-Muslim lands? Have they driven out more than 800,000 non-Muslims from their homes? Are the Muslim "extremists" killing people with different way of life in Kashmir and Chechnya? Do the "supremacist Muslims" dominate the UN for defining rights and rules for the rest of the world to follow? What else could be "aggressively seeking to dominate others," if not the dictation to get others secularised and liberalised for adapting the western ways of life? What else is "disempowering others," if not sanctions on Iraq, Iran, Libya, Sudan, Pakistan, Afghanistan, etc? And what does "destroying others" mean if not the scale of destruction in the Gulf War and the sanctions that follows it?

We are witnessing phase-two of an organised attempt to eliminate Islam. The present state of virtual anarchy in the Muslim world is the direct result of a similar phase-one in early and mid 20th century. The colonisers made a determined effort to end Khilafa, centralise and empower the Muslim states, control the private religious endowments (awqaf) that once sustained the juristic class, co-opt the clergy, and transform them into salaried employees. Confusion was created, whereby no one knew as to who speaks with authority on religious issues. In phase-one, legitimacy of the clergy was targeted. In phase-two his existence is being challenged. Religious groups are banned, Madrassa are being transformed into no less than public schools, and stigma is being attached to words like Mulla, Maoulana, Ulama, Jihad and even Islam. The profound vacuum in religious authority is being filled with the modern interpreters of Islam like Abou El Fadl.

Its easy to say than to substantiate that "militant Puritans" read Qur'anic verses "literally and ahistorically." Quran is not a simple book that anyone can interpret without the required knowledge and actual context. Quran is actually a guide for the humanity and it was meant for the generations to follow till he day of judgement. It was not meant for, or limited to, the momentary utility. Every instruction and every guidance is for all the generations to come. So, it is very difficult to conclude that some of its portions have no practical utility today. Or that such portions of the Quran lead some Muslims to "highly exclusionary conclusions."

As far the limits of tolerance is concerned, the Muslim reaction around the world is not due to wrong interpretation of Islam but due to their crossing all the limits of enduring western double standards and their treatment as second class citizens of this planet. And the Quran tells them explicitly: "O you who believe, stand firmly for justice, as witnesses for God, even if it means testifying against yourselves, or your parents, or your kin, and whether it is against the rich or poor, for God prevails upon all. Follow not the lusts of your hearts, lest you swerve, and if you distort justice or decline to do justice, verily God knows what you do," (4:135).

The so-called intolerance is in fact resistance shown by the Muslims with standing up for justice even against their own self-interests. The

secularism. To the secular ideology, religion, moral tradition and the complex of established institutions are irrational and unscientific and subjective, it seems.

The basic clash of these ideologies occur when the Islamic ideology assert that what animates every organism, what constitutes its nature, is purpose: if it be accepted, the idea of purpose, of intention, of the motive power of a goal or ideal rather than of an organic "drive," changes the orientation of our psychical views. Man is drawn towards a goal; and that goal often cannot be perceived or apprehended through the methods and theories of economic development or exact science.

Perhaps at no time has the comparison of Islamic and the undeclared western ideology been more pertinent than it is today. Due to unimaginable intensity of the propaganda, Islam is being lumped with the failed ideologies of Western liberalism, communism, socialism, and all other -isms have been put to the test and proved incapable to govern human lives. Islam definitely is an ideology, but unlike the aforementioned three factors associated with an ideology, in Islam it means the basic concepts on which the systems of life are established. Islam is not a 'religion' in the ordinary sense of the word. Religion is the English equivalent for the Arabic word Mazhab, which does not occur even once in the whole of the Holy Quran. The Quran has, instead, used the word Addeen for Islam, which means a particular way of life and, in a nut shell, Islamic Ideology is another name for Permanent Values or Inviolable Principles elaborated in the Holy Quran. And the same principles constitute the basis of the political, economic, and social systems.

The ideology-less religious concept considers relationship with his God as essentially an individual and private affair. In lonely seclusion he seeks through worship God's forgiveness and bounties, and having done that, proceeds according to his sweet will, to engage in mundane matters. The separation of religion from state and othe rpublic affairs amounts to negating part of the Quranic injunctions, for which there is no room in Islam at all. According to the Holy Quran:

" ...Do you then believe in a part of the Book and disbelieve in the other? What then is the reward of such among you who do this but disgrace in the life of this world, and on the day of resurrection they shall be sent back to the most grievous chastisement, and Allah is not at all heedless of what you do." (Al Baqara; 2:85)

The most important difference between Islamic and the prevailing western ideology is that Islam doesn't impose its ideology on the non-Muslim societies the way the 21st century coalition of the western forces impose their values on the Islamic world. Despite being considered evil, the Taliban didn't even think of imposing their values on people living in Washington and London the way the power brokers in these capitals think of changing basic values and the way of life in Afghanistan, Pakistan and elsewhere in the Muslim world. They consider imposing their western way of life as a prime responsibility and any resistance to occupation, oppression and injustice in the Muslim world as extremism and terrorism.

Did any single Muslim individual, let alone state, from amongst the 1.2 billion adherents to the Islamic faith ever proposed any change in the American constitution like the American Congressmen proposing changes in Pakistan's constitution? This fact must be suffice to clarify the nature of the two ideologies: one is the way to establish Deen in the Muslim societies according to the Quranic injunctions and the other is a para-military-cum-intellectual campaign to impose its own values on the rest of the world. One is complete in guidance for all aspects of human life, the other is replete with all the three forms of dispensation: intellectual, practical and moral. One is at peace with itself, and the other trying to clash with it and also make its adherents clash among themselves under the proud propaganda slogan: "we want a war within Islam." The proponents of western ideology must realise that their modes of thinking and war are far worse than what was attributed to the Taliban to present them as monsters of the present age. An impartial assessments of the available facts would convince anyone with average IQ that Islamic ideology is not a curse that needs to be needlessly targeted by the intolerant and extremist proponents of an unnamed western ideology.

Media Power

By: M.H. Faruqui*

Time, Newsweek and **CNN** are supported by commercial sponsors. **BBC** and **VOA**, etc. are financed by governments. It is not possible to run a quality magazine solely on the basis of subscriptions. In turn their sponsorship determines their editorial agenda.

This year the British Foreign Office gave the **BBC World Service** *ƒ* 181.8 million (*ƒ* 170 m last year) as grant in aid so that the Corporation could run a *free* news service in several important world languages. It was not charity; it was *foreign policy*. Besides *projecting Britain's values and promoting the English languages*, the main object behind funding the BBC World Service was to enable it to be *the world's reference point*.

That being so, *ƒ* 181.8m was a paltry sum to spend if it helped to influence opinion and shape policy making around the world.

The USA too is now going to *invest* at least half a billion dollars to set up a 24 hours, seven days a week, satellite channel program directed only to the Muslim countries. This is besides the Voice of America and the recently set up Voice of Free Afghanistan. Why are they so keen to inform the Muslims alone at a cost of five hundered million dollors?

'The war of words is as important as the war of bullets,' explained Marc Nathanson, chairman of the Middle Eastern subcommittee of the American Broadcasting Board of Governors.

(Published & Managing Editor, Impact International, London)*

Vol:11 Regd.CPL No.127 No.9

Weekly Nida-e-Khilafat Lahore

View Point

Abid Ullah Jan
(E-mail: abidjan2@psh.paknet.com.pk)

Clashing With Islamic Ideology.

The crux of the last 12 years' intensive anti-Islam propaganda in the western electronic media and press is that Islam is an ideology, an ism, which inspires fundamentalism and violence. Pick up any leading article from the mainstream American and European media or watch any talk show, the sum of their discussions is the same theme. Do the Muslims need to be defensive or apologetic in addressing the crux of anti-Islam propaganda? Do we need to spring into action to crackdown on religious institutions and related aspects of religion in a bid to put forward an ideology-less Islam? Or we need to clarify as to what kind of picture about ideology has been painted that a specific set of negative pictures come to mind as soon as the word ideology is used? Don't we need to present the difference between the perceived and real Islamic ideology?

To the Western public, ideology is presented as a triple form of dispensation: intellectual, practical and moral. They are told that intellectual dispensation consists of retaining only facts favourable to the thesis one is defending, even, if necessary, inventing them, and of denying, omitting, or forgetting others to keep them from becoming known. Lets take a pause and imagine if the leading political analysts in the western mainstream media are not addicted to the same practice of retaining facts favourable only to their version of the reality about Islam.

Practical dispensation is presented as suppressing the criterion of effectiveness in judging policies, depriving setbacks and failures of all refutational value. One of the functions of such ideology is also to fabricate explanations that absolve it. Is not the way the US and UK justified their policies in the post September 11 period reflective of this approach? Is not their explanation mere affirmation, an act of faith?

Regarding moral dispensation, it is said that it abolishes all notions of good and evil; or rather, for them it is the service due to ideology that replaces morality. What is crime or a vice for the common run of mortals is not one for them. Is not this kind of dispensation more close to the modern values of life and lifestyles in the western thought than the Islamic teachings? Judged by the standards of the meanings associated with ideology by the western analysts, policies of the major western capitals are more based on an unnamed ideology than the ideology of Islam. Why should ideology be considered as an evil when associated with Islam, but a blessing when practiced without naming it by all the leading countries in the crusade against Islamic ideology?

According to the late 20th century political analysts, religions should be distinguished from ideology. They believe that religion becomes an ideology as soon as it is extended into the social and political domain. The public is led to believe that Islam in particular is serving as ideological vehicle for wars of conquest and colonization to forcibly impose on the vanquished a radical metamorphosis of society. May we ask what the US and its allies are doing in Afghanistan, Egypt, Algeria, Pakistan and other places in the Muslim world if not trying to impose a radical metamorphosis of society and a way of life they consider right?

If the principal characteristic of an ideology is its impermeability to "alien" information in order to protect an interpretative system, then it becomes clear that ideological enrobing immunizes entire constellation of the western convictions against assault of reality by the Muslims in almost all sphere of thought and activity. To save the unnamed western ideology, Al-Jazeera shall be silenced, internet sites shall be closed down, news reports shall be censored, dissenters shall be jailed and a grand network of mainstream media be developed to marginalize any voice that challenges the status quo of the prevailing western ideology.

Ideologues like Thomas L. Friedman, Daniel Pipes, A.M Rosenthal, Amos Perlmutter, Jim Hoagland, Samuel P. Huntington, Bill Maher, etc do not think of themselves as simplifiers or sloganisers of an ideology. They believe they are objective and scientific, even dispassionate. All faithful followers of the systematized western ideologies believe themselves to be objective; their adversaries in the Muslim world are subjective. Such devotee of objectivity pride themselves upon being realists, men who perceive the world as it truly is, without being deluded by visions, personal interests, or irrational emotions. But no man is more unphilosophical than one who fancies that he is totally objective.

The core of their secular belief is that human nature and human society may be improved infinitely - no, perfected - by the application of the techniques of the physical, biological and modern social sciences to the governance of men. For the convinced secular-ideologue, traditional religion, particularly Islam, has been a nuisance and a curse, because it impedes the designs of the secular ideological planner. Science, with capital S, should supplant God/Allah. The religious teacher would give way to the "scientific" manager of the new society.

This rather vogue claim that religion has no place in the society (except China or where the US needs to exploit it) which can be regulated on "scientific" principles has had an appeal for some physical and biological scientists; and the less such scientists have known of human letters, history, religion and political theory, the more enthusiastic they have tended to be for a new order which would sweep away all the errors and follies of mankind by a rational application of secular and scientific theory and method. The high achievements of physical and biological sciences in the 20th century gave powerful reinforcement to the advocates of